حیدرآباد فرخندہ بنیاد سے شائع ہونے والا قدیم متوازن علمی و ادبی ماہ نامہ

سب رس

جنوری 2017ء

-/30 روپے

ISSN-2278-6902

ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد

پروفیسر ایس۔ اے۔ شکور معتمد عمومی ادارۂ ادبیات اردو نے اردو ہال حمایت نگر، حیدرآباد میں محترمہ قمر جمالی کی ناول "آتش دان" کی رسم رونمائی انجام دی۔
تصویر میں جناب زاہد علی خان، ایڈیٹر روزنامہ سیاست، صدر ادارہ، پروفیسر اشرف رفیع، پروفیسر بیگ احساس، محترمہ قمر جمالی،
ڈاکٹر حبیب نثار، ڈاکٹر آمنہ تحسین وغیرہ دیکھے جاسکتے ہیں۔

پروفیسر بیگ احساس اور پروفیسر محمد شوکت حیات، ای۔ کنٹنٹ ڈیولپمنٹ پروگرام (UGC-CEC/NME/CT) کے تحت ای۔
لرننگ پروگرام ایجوکیشنل ملٹی میڈیا ریسرچ سنٹر، انگلش اینڈ فارن لینگویجس یونیورسٹی (EFLU) حیدرآباد میں ویڈیو اسباق ریکارڈ کرواتے ہوئے۔
یہ اسباق وزارت برائے فروغ انسانی وسائل، نئی دہلی کے ماسٹرز ڈگری پروگرام کے لیے تیار کروائے جارہے ہیں۔

بنیاد گزار سید محی الدین قادری زور

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

جلد: ۷۹ شمارہ: ۱ ماہ: جنوری سال: ۲۰۱۷ء

مجلس ادارت

❁ سرپرست: راجکماری اندرا دیوی دھن راج گیر جی

❁ صدر: جناب زاہد علی خاں

❁ معتمد عمومی: پروفیسر ایس۔اے۔شکور

مجلس مشاورت

❁ پروفیسر گوپی چند نارنگ

❁ پروفیسر مجتبیٰ حسین

❁ پروفیسر اشرف رفیع

مدیر

پروفیسر بیگ احساس

قیمت: -/30روپے

زرِ سالانہ

❁ ہندوستان: **300**روپے

❁ کتب خانوں سے: **400**روپے

❁ پاکستان و بنگلہ دیش: 600روپے

❁ مغربی و عرب ممالک سے60ڈالر یا40پاؤنڈ

Phone: 040-23313311 **Editor: 9849256723** **Fax: 040-23374448**

مراسلت و ترسیل زر کا پتہ: ایوانِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، سوماجی گوڑہ، حیدرآباد .500 082 انڈیا

برقی پتہ: *E-mail: idarasabras@yahoo.in*

چیک یا ڈرافٹ: **The Sabras Monthly, Hyderabad** کے نام سے ارسال کریں۔

بیرون حیدرآباد چیک کلیرنگ چارجس -/60روپے زیادہ

پرنٹر و پبلشر پروفیسر ایس۔اے۔شکور نے طہٰ پرنٹ سسٹمس ہلکری کا پل میں طبع کرواکے ادارۂ ادبیات اردو سے شائع کیا۔

خواتین کیلئے قیمتی تحفہ

کلونجی

زیادہ سے زیادہ خواتین ہمارے بیوٹی پروڈکٹس کی منفرد کوالٹی کو محسوس کر رہی ہیں۔

آپ کی بہتر سے بہتر انداز میں خدمت پر ہمیں فخر ہے۔

آپ کے حسن کیلئے اس سے بہتر کچھ نہیں۔

خواتین کا
من پسند اور
آزمودہ نسخہ

زم زم بہار ہیئر آئیل
• بالوں کا جھڑنا روکتا ہے۔ • سر میں بفا دور کرتا ہے۔ • بالوں میں تازگی پیدا کرتا ہے۔ • بالوں کو لمبا کرتا ہے۔ • بالوں کی جملہ شکایات کیلئے مفید ہے۔ • سر درد و دماغی سکون کے علاوہ چین کی نیند کیلئے مفید ہے۔

کلونجی فیرنس کریم
• چہرے سے داغ دھبے دور کرتا ہے۔
• جھائیوں اور زائد تیل کو نکالتا ہے۔
• چہرے کی جلد کی رنگت کو گورا ملائم اور خوبصورت بناتا ہے۔

کلونجی پمپل کریم
• چہرے کے کیل مہاسے • باریک داغ • چہرے کے جملہ داغ مٹاتا ہے • چہرے پر پیدا ہونے والی جھریوں کو ختم کرتا ہے • آنکھوں کے نیچے کالے حلقوں کو دور کرتا ہے۔

کلونجی ہربل ٹوتھ پاوڈر
دانتوں کے جملہ امراض، دانت کا ہلنا، دانت میں تکلیف، دانت کا کیڑ، منہ سے بدبو آنا وغیرہ میں نہایت مفید ہے

آپ بھی آزما کر دیکھئے

ہمارے دیگر پراڈکٹس

- کلونجی تیل
- کلونجی مساج آئیل
- کلونجی پین بام
- سفوف ظہیر
- اکسیر معدہ
- سفوف اپسرا
- سفوف دمہ
- کلونجی شوگر پاوڈر
- کلونجی چیون پراش
- اکسیر جگر
- معجون کلونجی
- کلونجی شیمپو پاوڈر
- مرہم کافوری
- روغن گیسو دراز

حسن بے مثال کی شان

جو دیکھے یہی کہے، بہت حسین لگتی ہے۔

Mfg. Lic. No. 327/DU/98

MFG. MOHAMMEDIA PRODUCTS

Karim Nagar, (A.P.)

MRKT. BY S.J. AGENCIES

Opp : Rama Krishna Theatre, J.N.Road, Abids.

Ph : 66621834, 9346669505, 9346209091

ہمارے پراڈکٹس تمام میڈیکل ہال، دواساز اور جنرل اسٹورس پر دستیاب ہے

اس شمارے میں

اداریہ

اداریہ	بیگ احساس	07

مضامین

نظم جمیعت	لئیق صلاح	09
ابرار رحمانی کی اداریہ نویسی: ایک جائزہ	اسیم کاویانی	18
نارنگ شناسی: ادبی تھیوری، شعریات اور گوپی چند نارنگ	بلراج بخشی	31

آپ بیتی

یادیں	راجکماری اندرا دیوی دھن راج گیر/اشرف رفیع	42

طنزومزاح

غالب شناس یا غلبچی	خامہ بگوش	46

شاعری

مظفر حنفی، محمد عابد علی عابد، جنوں اشرفی، مسلم نواز، شاہد پٹھان	جمیل نظام آبادی، اختر شاہجہاں پوری، جمیلہ نشاط اسنیٰ بندر، انیس پروین	50

افسانے

ابتدا کی طرف واپسی	احمد رشید	57
تین بڈھوں کو یہ کیا سوجھی!	محبوب پاشا اعظمی	64

خاکہ

کیسے راوی داستاں کی داستاں کہا جائے مگر: آہ راشد بھائی	قمر جمالی	68

نقد ونظر

ف۔س۔اعجاز کے مضامین ''ارتکاز''، ابوالکلام آزاد: بصیرت اور عمل	علی احمد فاطمی، شمس الہدیٰ دریابادی	72

جو وہ لکھیں گے جواب میں

علیز احسن، علیم صبا نویدی، محمد عابد علی عابد،	اقبال مجید اللہ، مسعود جعفری	78

Baig Ehsaas' short stories mainly deals with the problem of Muslim middle class characters caught in the dilemma of conservatism and modernity. Driven helplessly by forces of globalisation, they move back and forth in search of green pastures and crushed under the pressure of growing rich overnight, they go through cycles of deprivation and over indulgence of repressed desires with the result that the happiness, they want to chase is ever elusive, Baig Ehsaas uses allegorical and symbolic techniqes to delineate the persona and social problems of the Muslim milieu specially in and around Hyderabad and their emotional links with expatriates living in the Gulf countries. His storyline at places is thin but his artful treatment of the subject leaves an impress on the mind of the reader.

Gopi Chand Narang

بیگ احساس

کے

افسانوں کا مجموعہ

دَخمہ

قیمت: -/200روپے

عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی۔۹۵

اداریہ

نئے سال کا آغاز.....!!

نئے سال کا استقبال ہر سال کیا جاتا ہے۔ پہلے تو لوگ گھروں میں نیا سال منا لیا کرتے تھے۔ دولت مند طبقہ کلبوں اور پانچ ستارہ ہوٹلوں میں نیا سال کی آمد کا انتظار کیا کرتا تھا لیکن گلوبلائیزیشن کے بعد نیا سال اس زور وشور سے منایا جانے لگا کہ سارا شہر شور و غل اور طوفان بدتمیزی سے کانپ جاتا ہے۔ شراب کی دکانیں کھلی نہیں رہتیں اس کے باوجود شراب کا بے دریغ استعمال ہونے لگا ہے۔ دو پہیوں کی گاڑیوں پر تین تین چار چار نوجوان سوار تیز رفتاری سے چیختے چلاتے سڑکوں پر دندناتے ہوئے گزرتے ہیں۔ جن کے پاس کار ہے کھلی جیپیں ہیں وہ بڑی آواز میں گانے بجاتے ہیں اور نوجوان بیچ سڑک پر ڈانس کرنے لگتے ہیں۔ سال نو کے موقع پر بنگلورو میں بدترین واقعہ ہوا۔ ایم جی روڈ برتیج اور بریگیڈر روڈ پر نوجوان مرد اور خواتین کی بڑی تعداد سال نو منانے کے لیے جمع ہوئی۔ بے شمار پولیس جوانوں کے باوجود جنسی ہراسانی اور دست درازی کے 756 کیس ہوئے۔ لڑکیاں بدحواسی کے عالم میں لیڈی پولیس سے مدد مانگنے لگیں۔ اوباش نوجوانوں کے مقابلے میں پولیس بے بس نظر آئی۔ جب اس بدترین واقعے کے بارے میں پولیس کمشنر سے پوچھا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ کسی نے کسی کے خلاف کوئی شکایت درج نہیں کروائی۔ نئے سال کے اس حادثے کے بعد بھی بنگلورو میں لڑکیوں سے دست درازی کے پے در پے کئی واقعات ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ دہلی کی طرح بنگلورو بھی اب لڑکیوں کے لیے محفوظ شہر نہیں رہا۔

کرناٹک کے وزیر داخلہ جی پرمیشورا اور مہاراشٹرا کے ایس پی رکن اسمبلی ابوعاصم کا بیان کچھ اس طرح تھا کہ آدھی رات تک نیم عریاں لباس میں جشن منانا، مغربی تہذیب کی اندھی تقلید کرنا ہمارا کلچر نہیں ہے۔ اکثر خواتین نیم عریاں لباس میں اپنے دوستوں کے ساتھ آدھی رات کو سڑکوں پر نکل آتی ہیں تو ایسے واقعات پیش آتے ہیں۔ ان کے اس بیان پر قومی کمیشن برائے خواتین (این۔سی۔ڈبلیو) نے سمن جاری کر دیا۔ کمیشن کی صدرنشین للیتا کمارا منگلم نے کہا ''ہم ان دونوں کے نام سمن جاری کر چکے

ہیں ہمارے سماج میں چند ایسے بھی مرد ہیں جو اس قسم کے عجیب اور تکلیف دہ بیانات دیا کرتے ہیں۔اگر اس سطح کے مرد بھی اس قسم کی باتیں کرتے ہیں تو سوچئے ملک کدھر جارہا ہے''۔

پتہ نہیں ہمارا ملک کدھر جارہا ہے۔ایک طرف آئی۔ٹی کمپنیوں کو قیام کی اجازت دینے میں ہر ریاست سبقت حاصل کرنا چاہتی ہے۔بڑے شہروں میں آئی ٹی کمپنیاں ہیں روزگار کے مواقع بھی کھل گئے ہیں ملک کے مختلف علاقوں سے نوجوان آکران کمپنیوں میں کام کرتے ہیں اچھی خاصی تنخواہیں پاتے ہیں۔باہر سے آنے والے ان نوجوانوں کو کوئی روکنے ٹوکنے والا بھی نہیں ہوتا۔بنگلورو میں سب سے زیادہ آئی ٹی کمپنیاں ہیں۔ان کمپنیوں میں رات کو کام ہوتا ہے۔نوجوانوں کو آپس میں ملنے جلنے کے مواقع ہوتے ہیں۔یہ کمپنیاں ایسا ماحول فراہم کرتی ہیں کہ نوجوان خود کو دوسروں سے برتر تصور کرنے لگتے ہیں۔یہاں مغربی کلچر کو اپنایا جاتا ہے ویک اینڈ پر لڑکے لڑکیوں کی پارٹیوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔یہ لڑکے لڑکیاں خود کو مغربی ملک کا ایک حصہ سمجھنے لگتے ہیں۔دوسری طرف نوجوانوں کا آزادانہ میل جول ہندوستانی معاشرہ قبول نہیں کرتا۔یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ان کمپنیوں میں کام کرنے والی لڑکیوں کی شادیاں مشکل سے ہوتی ہیں یا نہیں ہوتیں۔ہندوستانی لڑکیاں دوہرے معیار کو اپنانے پر مجبور ہوتی ہیں۔گھر اور سماج میں کچھ کمپنیوں میں کچھ.....!! اس کے باوجود مسائل حل نہیں ہوتے۔سال نو کے موقع پر اور ایسے ملے جلے اجتماعات میں جب نوجوان خود کو قابو میں نہیں رکھ سکتے تو ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں۔(ترقی یافتہ ممالک کی بات اور ہے۔وہاں تو پردہ کرنے والی خواتین کو برداشت نہیں کیا جارہا ہے۔ٹرمپ کی آمد کے بعد حجاب والی خواتین پر کئی حملے ہوئے ہیں)۔نہ تو ہم پوری طرح مغربی کلچر کو اپنا سکتے ہیں۔نہ ہمیں ویسی سہولتیں حاصل ہیں۔جب تک ہمارا معاشرہ ان باتوں کو انگیز نہیں کرتا یا یہ ساری چیزیں ہماری تہذیب کا جز و نہیں بنتیں ایک طرح کے محتاط رویّے کی ضرورت ہے۔علاج سے احتیاط ہی بہتر ہے۔پولیس بھی یہ کہہ کر کہ کسی نے کوئی شکایت درج نہیں کروائی اپنی ذمہ داری سے غفلت نہیں برت سکتی۔اس طرح کے واقعات کا انسداد ضروری ہے۔شہر حیدرآباد میں پولیس نے بڑی حد تک اس طرح کے واقعات کی روک تھام میں کامیابی حاصل کی ہے۔ویسے بھی اس شہر کی ایک خاص تہذیب ہے جو ایسے واقعات کی اجازت نہیں دیتی۔ہمیں ایسے معاملات میں سنجیدگی سے سوچنے کی ضرورت ہے۔ہندوستانی سماج کے دوغلے پن کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔گلوبلائیزیشن کے فائدے ہمارے ملک کی تہذیب کو ملحوظ رکھتے ہوئے اٹھانے پر غور کرنا چاہیے۔

ڈاک خرچ میں اضافہ کے باعث بیرونِ ملک کے زرِ سالانہ میں تھوڑا سا اضافہ کیا گیا ہے۔امید ہے کہ قارئینِ سب رس ہم سے تعاون فرمائیں گے۔

بیگ احساس

مضمون

لئیق صلاح

نظم جمعیت

''نظم جمعیت'' کا قیام آصف جاہی عہد میں عمل میں آیا، یہ ایک فوجی تنظیم تھی، جسے ''بے قاعدہ فوج'' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ مورخوں نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ نواب میر قمر الدین خاں آصف جاہ اول نے، دکن فتح کرنے اور ملکی انتظام کو استحکام بخشنے کے لیے ''بے قاعدہ فوج، ترتیب دی تھی۔ یہ فوج بلا لحاظ مذہب و ملت مختلف اقوام کے افراد پر مشتمل تھی۔ مثلاً عرب، سکھ، راٹھور، راجپوت، بلوچ اور ترک وغیرہ [۱]

یہ وہ دور تھا، جب مغلیہ سلطنت کمزور ہوگئی تھی، اور مرکز سے وابستہ امراء اپنے اپنے صوبوں کو بچانے کی کوشش کر رہے تھے جیسے شمال میں شجاع الدولہ نے، اودھ میں اپنی سلطنت قائم کی تھی اسی طرح آصف جاہ اول نے بھی ''دکن'' کو انتشار سے بچانے کے لیے تدبر سے کام لیتے ہوئے اس علاقے کو تباہ ہونے نہیں دیا۔

ان تاریخوں میں ''فوجی تنظیم''، ''لفظ'' بے قاعدہ سے موسوم کی گئی تھی۔ اس طرح ''جمعیت'' بھی فوج کے لیے مستعمل ہوا ہے۔ اس عہد کی قابل تعریف بات یہ تھی کہ ملکی اور غیر ملکی کا تصور ان کے ذہنوں میں نہیں تھا۔

''بے قاعدہ فوج، جس کا ذکر مندرجہ بالا سطور میں کیا گیا ہے ان میں دیگر افرد کے ساتھ ''عرب'' بھی شامل تھے۔ اس لیے یہاں ان عرب سپاہیوں کے تعلق سے چند اہم امور پیش کیے جائیں گے۔

میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے عہد میں، مرہٹوں سے ''کھرڑلا'' کے مقام پر جنگ ہوئی تھی۔ جس میں نظام کی فوج کو شکست ہوئی تھی۔ بالآخر انھیں مرہٹوں کی شرائط قبول کرتے ہوئے صلح کرنی پڑی۔ ریاست کے چند علاقے، محصول، بقایا رقم کی ادائیگی کے علاوہ مرہٹوں کی ایما پر ارسطو جاہ مدارالمہام کو بھی مجبوراً ارسطو جاہ کو جس باغ میں رکھا گیا تھا، وہاں ان کی حفاظت کے لیے، باقاعدہ فوجی افسران کے سوا، ایک ہزار ولایتی عرب بھی متعین کیے گئے تھے۔ [۳]

اس میں شک نہیں کے ''عرب ہند تعلقات'' قائم ہوئے ایک عرصہ ہوا تھا۔ لیکن یہ تعلقات دیگر نوعیت کے تھے۔ عرب تجارت کی غرض سے ہند کے ساحلی علاقوں پر آتے، اور اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لیے اس سلسلے کو قائم رکھتے تھے۔ لیکن بعد میں وہ تجارت کی غرض سے نہیں، ملازمت کی خاطر ہندوستان آئے تھے۔ چنانچہ انھیں یہاں سکونت اختیار کرنی پڑی۔ تب وہ فوجی خدمات انجام دینے لگے تھے۔ اس تعلق سے دو اہم اور مستند ماخذ ہیں جن سے عربوں کی ہجرت، حضرموت سے کب اور کیسے ہوئی کے بارے میں تفصیلی معلومات سے آگہی ہوتی ہے۔

ایک تصنیف صالح باد قیل عبداللہ کی بہ عنوان ''تاریخ حضرموت'' ہے جو 1384ھم 1964ء اعجاز پرنٹنگ پریس حیدرآباد سے شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں جغرافیائی معلومات فراہم کرنے کے علاوہ، تاریخی حقائق و واقعات کو بھی قلم بند کیا گیا ہے۔ وہاں کے قبائل اور ان کی حکومتیں، آپس میں جنگ و جدل کا حال، بعض قبائل مثلاً قعیطیہ (الیافعی) وکثیری وغیرہ کی ہندوستان مراجعت، اور ہندوستان کے ساحلی علاقوں کے راجاؤں اور مرہٹہ سرادروں کے یہاں فوجی خدمات انجام دینا۔ آگے مملکت نظام سے وابستگی، یہاں اعلیٰ فوجی عہدوں پر فائز ہونا، اور پھر مناسب و

جاگیرات اور خطبات سے سرفراز ہونا وغیرہ تمام جزئیات موجود ہیں۔ ٤

ڈاکٹر محمد عبدالنعیم جنہیں ایک مستند مورخ کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔انہوں نے بھی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف اور دیگر ذرائع سے عربوں کا نقل مقام جو 18ویں صدی کے اختتام سے 20ویں صدی تک جاری رہا کے تعلق سے مزید معلومات فراہم کی ہیں۔ ٥

1795ء میں پونا سے مدارالمہام ارسطو جاہ کی حیدرآباد آمد پر برٹش افواج کے ہمراہ ایک ہزار عربوں کا دستہ بھی تھا۔ ٦ یہاں پہنچ کر عربوں نے ، حیدرآباد میں مستقل سکونت اختیار کی، چنانچہ حکومت آصفیہ نے بھی، ان کے جذبات کی قدر دانی کرتے ہوئے پذیرائی کی تھی۔

حضرموت سے نقل مقام کرنے والے عروب قعیطی/یافعی تھے۔ ڈاکٹر محمد عبدالنعیم نے تحریر کیا ہے کہ یہ لوگ راست حیدرآباد منتقل ہوئے یا پھر غیر مسلم حکمرانوں کے زیر نگین رہ کر بعد ازاں یہ فوجی سپاہی مملکت نظام سے منسلک ہو گئے تھے۔اقتباقات ملاحظہ کیجیے۔

"During the Middle ages from the 18th century A.D. Hadramis emigrated to India, the immediate neighbour to the east and spread over various parts of western and Central India" (7)

"Most of Hadramis did not emigrate directly to Hyderabad. But on landing at seaports of Western India, settled there. Some of them dispensed to Hyderabad and other parts of India, and most of them sought service under the Non Muslim Maratha rulers of Western and Central India. Several thousands of Arabs were under the employment of the Maratha Armies".(8)

عمر بن عوض القعیطی 1775ء میں عرب میں پیدا ہوئے ۔ان کے بڑے بھائی عبداللہ بن عوض ناگپور کے مہاراجا کے یہاں فوجی خدمات پر مامور تھے۔عمر بن عوض بھائی کے یہاں ناگپور چلے آئے۔راجا عبداللہ بن عوض کی بہادری اور مستعدی سے بہت خوش تھا۔انہیں اعلیٰ عہدے پر فائز کیا تھا۔ان کے انتقال کے بعد راجا نے عمر بن عوض کی خدمات سے استفادہ کیا۔لیکن ایک مختصر سے عرصہ کے بعد راجا کی بھی موت واقع ہوگئی۔ان کے جانشینوں میں آپس میں جھگڑے ہونے لگے۔تب عمر بن عوض نے ناگپور میں رہنا مناسب نہیں سمجھا، اور 1818ء میں حیدرآباد آ گئے۔ جب وہ یہاں آئے اس وقت مدار المہامی پر راجا شیو پرشاد فائز تھے۔موصوف نے انھیں پہلے 100 عرب سپاہیوں کا جمعدار بنایا، جن میں ☆ مولد اور ولایتی دونوں تھے۔ ٩

☆ *The Emigrants from Arabia were called "Willageti" i.e. those who were either born in Arabic or were sprang from Arabian parents. The children of Arab fathers and Indian mothers were distinguished as "Muwaladua"*

ان کی کارگزاری اور فوجی صلاحیتوں کے پیش نظر، انھیں ترقی دے کر 500 عروب کی جمعداری پر فائز کیا۔ نظام نے انھیں اعلیٰ خطابات جاں باز جنگ، شمشیر الدولہ، شمشیر الملک سے سرفراز کیا۔

ان کے بعد یہ سلسلہ ان کے جانشینوں تک جاری رہا۔عمر بن عوض کے پانچ فرزند تھے۔اور یہ سب جمعدار کہلاتے تھے۔

۱) محمد بن عمر ۲) صالح بن عمر

۳) عوض بن عمر ۴) عبداللہ بن عمر

۵) علی بن عمر

عمر بن عوض القعیطی الیافعی بانی سلطنت القعیطیہ الیافعیہ تھے۔

ہمارے قدیم مورخین میں سے بعض نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ''بے قاعدہ فوج'' فن سپہ گری سے واقف نہیں تھی۔ یہ لوگ حضور نظام اور امراء کے محلوں (دیوڑھیوں) پر پہرہ دار کی حیثیت سے متعین تھے۔علاوہ ازیں پولیس، ڈاکوؤں اور رہزنوں کی تلاش یا خزانوں اور سرکاری کاغذات کی ایک مقام سے دوسرے مقام منتقلی، کے تعلق سے ان کا تعاون حاصل کرتی تھی۔

مذکورہ بالا بیان کی تردید، ڈاکٹر ایم۔اے۔نعیم اور Sir Richard Temple وغیرہ کی تحریروں سے ہوتی ہے جنھوں نے عربوں کی شجاعت، مستقل مزاجی، مستعدی کا اعتراف کرتے ہوئے ان کا شمار بہترین بہادر سپاہیوں اور سپہ سالاروں میں کیا ہے۔پروفیسر موصوف نے

"Arabs of Hadramuts and Hyderabad (India) Relation during 18th - 20th Centuries

میں اس خیال کا اظہار کیا ہے۔

"Arabs were prefered in the military by the Indian ruler for the bravery, skill and stead fastnes, in holding courageously the Garrisons of the forts as "Qaladers" etc." (10)

Sir Richard Temple بھی عربوں کی سپاہیانہ شان کا معترف ہے۔اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"Arabs possessed many Martial and soldiery qualities especially courage and endurance and their aptitude for holding together by mutual aid and suppot in movements of danger on trial was remarkable. (11)

"Reginald George Burton, a British Militiary Officer in the Hyderabad contigent describe the characteristic of Arabs and says that, there are perhaps no troops in the world that will make a stouter or more determined stand to their posts than the Arabs. Thus domestic political conditions and their demand in the Indian Armies facilitated the emigration of Arabs of India". (12)

آصفی حکمرانوں کے عہد میں فوج کی مختلف تنظیمیں تھیں۔حتیٰ ''زنانہ فوج'' بھی تھی، جن کا ذکر ان قدیم تاریخوں میں کیا گیا ہے، جو زنانہ محلوں کی حفاظت کے لیے متعین تھیں۔ان لوگوں نے بوقت ضرورت بہادری سے مقابلہ بھی کیا تھا۔۱۳

جنگ و جدل اور فوجی مہمات کے لیے جہاں مخصوص سپاہیوں کی تعین کیا جاتا تھا، وہیں جلسے، جلوسوں، شادی بیاہ کی رونق افروزی کے ضمن میں جن سپاہیوں کی خدمات سے استفادہ کیا جاتا تھا انھیں ''علی غول'' سے موسوم کیا گیا تھا۔یہ سپاہی عموماً محرم میں لنگر کے جلوس کے ہمراہ ہوتے تھے۔ William Arvine نے ان

سپاہیوں کا ذکر اپنی تصنیف The Army of the Moghals میں کیا ہے۔

اس کے علاوہ دیگر تاریخوں مثلاً گلزارِ آصفیہ ۱۴، تاریخ دکن ۱۵، اور تاریخ رشید الدین ۱۶ خانی میں بھی ان کا ذکر موجود ہے۔

ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے بھی اپنے مقالے ''مہاراجہ چند ولال'' میں ان کے تعلق سے تحریر کیا ہے۔ ۱۷

حیدرآباد میں لنگر کا جلوس خاص اہمیت کا حامل سمجھا جاتا تھا۔ 7ویں محرم کو بڑے تزک واحتشام سے اس جلوس کا اہتمام کیا جاتا تھا جس میں پیدل، سوار اور ہاتھی نشین امراء وعرب جمعدار بھی ہوتے تھے۔

میر تراب علی خاں سالار جنگ اولیٰ مدار المہام کا شمار باوقار و منتظم شخصیات میں ہوتا تھا۔ ان ہی کی مدار المہامی کے دور میں ''نظم جمیعت'' کا قیام 1285 فصلی مطابق 1875ء میں عمل میں آیا۔ اس مقصد سے کہ تقررات وغیرہ کے اندراجات صحت پر مبنی ہوں، اور جمعداروں کو مطلوبہ رقم فراہم کی جائے تاکہ وہ اپنے سپاہیوں کی تنخواہیں وغیرہ اجرا کر سکیں۔ ۱۸

محمد نواز الدین نگران کار سررشتہ فوج بے قاعدہ کو اس بات کا شدید احساس ہوا کہ محکمہ جمیعت کو قائم ہوئے 28 سال گزر چکے ہیں۔ لیکن قواعد وضوابط کو کتابی شکل میں محفوظ نہیں کیا گیا۔ چنانچہ انھوں نے 1313 فصلی میں ان قوانین کو کتابی شکل میں شائع کیا تھا۔ 256 صفحات پر مشتمل اس تصنیف کو موصوف نے تین جلدوں میں تقسیم کیا۔

پہلی جلد: فرائض، اقتداریت ناظم، تقرر، ترقی، تنزل، برطرفی حتی کہ سزائے جرائم فوجی بذریعہ کورٹ مارشل

دوسری جلد: احکام رخصت، عہدہ داران کے اختیارات، قواعد و منظوری رخصت، اقسام رخصت، تنسیخات و ترمیمات

تیسری جلد: قواعد رجسٹری، دستاویزات، جائدادوں کے نقشے، مختار نامہ، وصیت نامہ زیر نگرانی انسپکٹر جنرل بیرون ہند روانگی، پاسپورٹ، License، وغیرہ فارم کی خانہ پُری انگریزی میں

اگر یہ فوجی تنظیم نہ ہوتی تو محمد نواز الدین ''نظم جمیعت'' کے قواعد وضوابط پر ایک مبسوط تصنیف مرتب نہ کرتے، جس کا ذکر مندرجہ بالا سطور میں کیا گیا ہے۔

عمر بن عوض شمشیر الدولہ کی نسل میں کئی ایک اپنی اعلیٰ خدمات کے سبب حکمران وقت کی نگاہ میں باعزت قرار دیئے گئے تھے۔ ان کے فرزندوں، پوتوں، پر پوتوں کو بھی اعزازات و انعامات سے پذیرائی کی تھی۔ عوض بن عمر کو سلطان نواز جنگ اور ان کے بھائی صالح بن عمر (فرزند دوم شمشیر الدولہ) کو برق جنگ، برق الدولہ، صالح بن عمر کے صاحبزادے محسن بن صالح کو برق جنگ ثانی سطان نواز جنگ کے بڑے فرزند کو جانباز جنگ، فرزند دوم کو شمشیر نواز جنگ، جانباز جنگ کے فرزند کو سیف نواز جنگ، محمد بن عمر کے پوتے محمد بن صلاح کو شمیر یار جنگ اور شمشیر نواز جنگ کے فرزند کو عمر نواز جنگ کا خطاب عطا کیا گیا تھا۔

محمد بن صلاح شمشیر یاور جنگ کے خطاب سے سرفرازی پر محمد عثمان وکیل نے ایک قطعہ تاریخ بطور مبارکباد پیش کیا تھا۔

''یا محبوب''

عطا اللہ از شہ آصف بہ دربار چہل سالہ
خطا بے بے نظیری کز مسرت شد قبا یم تنگ
درِ اعدا سن ہجری بجستم سال تاریخیں
فلک گفتا جوان والا ہمم شمشیر یاور جنگ

جمع دار عرب کے یہاں دفتری امور کی انجام دہی کے

لیے، اسٹاف بھی ہوا کرتا تھا۔ ملازمین کی صلاحیتوں کے لحاظ سے، ان کو صدر چاؤش، ذی چاؤش اور چاؤش کی خدمات پر متعین کیا جاتا تھا۔ ان جمعداروں کے نام ''نظم جمیعت'' کے میجر جنرل اور لفٹنٹ کرنل کے یہاں سے مختلف امور کی انجام دہی کے لیے مراسلے روانہ کیے جاتے تھے، ذیل میں چند حوالے درج کیے جاتے ہیں۔

۱) مراسلہ محکمہ نظم جمیعت سرکار عالی صیغہ فشان 7176 واقع 28/10 1352ف بنام صلاح بن محمد صاحب جمعدار منجانب میجر جنرل سید احمد العیدروس بہادر ملٹری اڈوائزر نظم جمیعت

۲) نمبر 212: احکام نظم حسب الحکم عالی جناب ہز ہائنس جنرل والا شان نواب سر اعظم جاہ بہادر، پرنس آف برار (جی۔بی۔ای) ولی عہد سلطنت آصفیہ کمانڈر ان چیف افواج منجانب میجر جنرل سید احمد العیدروس بہادر (سی۔بی۔ای۔او۔بی۔آئی) ملٹری اڈوائزر نظم جمیعت سرکار عالی جلد 1355/4ف، 12/صفر 1365ء، 17/جنوری روز پنجشنبہ 1946ء

''حصہ دوم''

نذرِ تہنیت

۱) نمبر 213: بحوالہ آرمی آرڈر افواج باقاعدہ سرکار عالی 609 یکم/اسفندار 1355ف چوں کہ ہز مجسٹی کنگ امیر نے ہز ہائنس جنرل والا شان نواب سر اعظم جاہ بہادر، کمانڈر ان چیف دام اقبالہ، کو جی۔سی۔آئی۔ای کا خطاب عطا فرمایا ہے۔ لہٰذا کمانڈر افواج ملک کار عالی نے عساکر آصفی کی جانب سے خدمت گرامی میں نذر تہنیت پیش کی تھی، جس کا حسب ذیل لطف شدہ جواب بمراد علم جمیع وابستگان نظم جمیعت شائع کیا جاتا ہے۔

''میں فوج کی مبارک باد کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں''

۴) نمبر 216: جائیداد ہائے عوض طلب..... تختہ جائیداد ہائے عوض طلب زمرہ جات، فرقہ عروب تقرر

۵) مراسلہ محکمہ نظم جمیعت عروب سرکار عالی..... واقع 9/13 1357ف نشان 1989 منجانب لفٹنٹ کرنل محمد عبدالستار ناظم

بخدمت جناب جمعدار صلاح بن شمشیر یاور جنگ بہادر

۶) مراسلہ محکمہ نظم جمیعت عروب سرکار عالی واقع 9/19 1357ف نشان 2040 منجانب لفٹنٹ کرنل محمد عبدالستار ناظم

بخدمت شریف جناب جمعدار صلاح بن شمشیر یاور جنگ بہادر جمعدار کمیٹی مشاورتی

۷) منجانب عمر نواز جنگ بہادر بخدمت مکرمی جناب صلاح بن محمد صاحب دام اقبالہ جمعدار نظم جمیعت

۸) نشان 612: مراسلہ محکمہ نظم جمیعت عروب سرکار عالی واقع 11/3 1358ف منجانب لفٹنٹ کرنل محمد عبدالستار ناظم

بخدمت نواب عمر نواز جنگ بہادر جمعدار عروب منظوری رخصت اتفاقی برائے روانگی ممبئی مثنیٰ خدمت جناب صلاح بن محمد صاحب جمعدار اطلاعاً وتعمیلاً مرسل ہے۔

دعوت نامے

۱) پرنس والا شان نواب اعظم جاہ بہادر نے باقاعدہ فوج کے ایٹ ہوم منعقدہ بروز پنجشنبہ 16/اگست 1934ء شام 4 بجے سکنڈ لانسر Mes میں نواب شمشیر یاور جنگ کو مدعو کیا تھا۔

۲) ایک اور دعوت نامہ ہز ہائی نس....... کی جانب سے نواب صلاح بن شمشیر یاور جنگ بہادر کے نام، ملٹری اسپورٹس، مورخہ 16/فروری 1937ء بروز سہ شنبہ بمقام فتح میدان ایچ دی نظام کی سلور جوبلی کے اعزاز میں ارسال کیا گیا تھا۔

۳) بنام صلاح بن شمشیر یاور جنگ بہادر بتقریب پیش کشی اڈریس سلور جوبلی مبارک، درباری لباس میں حاضر دیوڑھی بلا واسطہ ہونے

کا افتخار حاصل کا جائے۔

حسب الحکم ہز ہائنس پرنس آصف برار جنرل والا شان ولی عہد بہادر دام اقبالہ کمانڈر نظم 2/ذی الحجہ الحرام 1355ف ۴) بنام صلاح بن محمد بتقریب سلور جوبلی ہز اکسلنس ہائی نس دا نظام 14/فروری 1937ء

چمپا پیٹ میں اس فوجی تنظیم کا ایک شاندار اجلاس کا انعقاد عمل میں آیا تھا جس کے البم سے چند تصاویر پیش کی جائیں گی۔ البم کے سرورق پر یہ عنوان درج ہے۔

"Review of Nazme Jamiet Forces
In Honour of
Parent Wala Shan Prince Azam Jah Bahadur
Commander in Chief
Champapet, Hyderabad, February 1935

اس البم کے پہلے صفحے پر نواب اعظم جاہ بہادر کی شان دار تصویر فوجی لباس میں مع تلوار ہے اور تصویر کے نیچے یہ عبارت درج ہے۔

Walashan Major General Prince Azamjah
Bahadur Commander in Chief State Forces

شمشیر یاور جنگ بہادر مرحوم، خود کو سلطنت آصفی کا موروثی وفادار و جان نثار سمجھتے تھے۔ اور حضور پُر نور بھی اپنی کرم فرمائی سے ان کے اعزاز و اکرام کا بطور خاص خیال فرماتے تھے۔ موصوف نے قرآن مجید کا ایک طلائی نسخہ، حضور پُر نور کے کتب خانہ ذاتی کے لیے ہدیتاً پیش کیا تھا، جو جد اعلی عمر بن عوض شمشیر الدولہ مرحوم کو اورنگ آباد کی درگاہ شریف کی ایک بزرگ ہستی نے عنایت فرمایا تھا۔

اعلیٰ حضرت کی خدمت میں جو مکتوب پیش کیا گیا، اس میں تفصیلی ذکر موجود ہے (جس کی نقل منسلک ہے) ۱۹ شمشیر یاور جنگ کے ہمراہ ان کے دونوں فرزند صالح بن محمد اور صلاح بن محمد بھی تھے۔

(مورخہ ۹/ربیع الثانی، ۱۳۳۷ ف، پنجشنبہ ۳، ساعت شام ۶، اسفندار ۱۳۲۸ف

درج ذیل اقتباسات بطور نسخہ پیش خدمت ہیں

"The Jamadars of the Nizams Army held such a high and important position that when the British Resident Colonel Davidson presented Royal gifts on behalf of the Queen of England at the Nizam's Court on 24th Rabi 1278 AH (5th October 1861) to the Nizam and other dignitaries, he also brought to the Jamadar Saifal Dowala and Shamsheer Al Dowla.
Again in 1877 when Awad Bin Umar attended, Delhi Darbar (Court) the British honoured him with 12 guns salute. (20)

امرائے عظام اور باج گزار ریاستوں کے علاوہ دربار کے متوسلین اور خطاب یافتہ روٴسا میں سلطان مکلا بھی تھے۔ جو نہ صرف حکومت برطانیہ کے خطاب یافتہ تھے، بلکہ برطانوی ہند میں توپوں کی سلامی بھی ملتی تھی۔ ۲۱

یامن یلوح الارض من امضائه
ویسیر جیش الفتح تحت لوائه
وابد کمال نوال عاطفته الی یوم الدین
خلد الله ضلال سلطانته علی مضارق العالمین

بندر گان علی متعالی مدظلہ العالے
اعلیٰ حضرت قدر قدرت قومی شوکت
لمہ طور منبع نور
بموقف عرض
میرساند

کمترین غلام سرکار والا تبار و موروثی جان نثار دولت ابد پائدار بصد ادب ایک تحفہ برکت مجسم اعنی قرآن مجید کا ایک نایاب طلا کار قلمی نسخہ (جس کے بین السطور فارسی ترجمہ ہے) لے آیا ہے۔

اس نسخہ رحمت و دولت پر عظمت کی روایت تاریخی بزرگوں سے اس طرح ظاہر ہوئی ہے کہ یہ نسخہ نایاب حضرت فردوس آرام گاہ کے لیے خاص اہتمام کے ساتھ لکھوایا گیا تھا۔ جو ودیعتاً حضرت سید شاہ کالے میاں صاحب قدس سرہ مرشد پادشاہ دہلی کے پاس آیا اور اون سے یہ دولت دارین اونکے صاحب زادے حضرت سید شاہ غلام نظام الدین صاحب قدس سرہ کو حاصل رہی اور جب اس غلام جان نثار کے جدّ اعلیٰ (عمر بن عوض شمشیر الدولہ مرحوم) ملک عرب سے وارد ہند ہوئے اور سرکار دولت مدار خلد اللہ ملکہ وسلطانہ کی جان نثاری میں جنگ و جدل کے جوہر دکھائے اور سرخروئی کے تمغے حاصل کرتے ہوئے اورنگ آباد داخل ہوئے اور حضرت شاہ غلام نظام الدین صاحب قدس سرہ کی زیارت کا شرف حاصل کیا تو اس موقع پر بکمال عنایت یہ نعمت عظمیٰ بھی سرفراز ہوئی۔

اب خانہ زاد کی یہ آرزو ہے کہ یہ ودیعت متبرک ہمیشہ کے لیے زینت بخش کتب خانہ مبارک رہے۔ اسی آرزو کے شرف قبولیت کی نذر گزارنے کے لیے یہ غلام جان نثار..... اقدس پر کمر بستہ حاضر ہے۔

زیادہ حد ادب

الٰہی آستان دولت ابد مدت....... سلاطین ربع سکون باد
لا ذلت فی فلک الا اقبال مرتقیا
منور البلاد الشرق والغرب
المعروضہ ربیع الاول ۱۳۳۷
عرضے
غلام جان نثار شمشیر یاور جنگ
بندگان عالے مدظلہ

بتاریخ ۹ ربیع الثانی ۱۳۳۷ م ۶ روز پنجشنبہ بملاحظہ اقدس اعلیٰ حضرت حضور پرُنور مع مصحف قرآن شریف قلمی صلاو مترجم فارسی قلمی سرخ نذر گذرانداہا گیا۔ بالمشافہ معیت فرزندان صالح وصلاح بن محمد فقط بوقت ۳ ساعت شام۔

فقط

۲۸/۴/۱۶ ف	محمد بن صلاح شمشیر یاور جنگ ۲۲ع

OOO

حواشی:

۱) گلمز آف دی نظامس ڈومینین، ص112
۲) ارسطو جاہ سید تمکین کاظمی (مرتبہ ڈاکٹر لئیق صلاح) ص185
۳) ارسطو جاہ سید تمکین کاظمی (مرتبہ ڈاکٹر لئیق صلاح) ص192
۴) صالح عبداللہ باد قیل، تاریخ حضرموت، ص137-136
۵) Dr. Muhammad Abdul Nayeem - Arabs of Hadramut and Hyderabad (India), Relations during 18th - 20th Centuries Pg. 31-32
۶) Dr. Muhammad Abdul Nayeem - Arabs of Hadramut and Hyderabad (India), Relations during 18th - 20th Centuries Pg. 34
۷) Dr. Muhammad Abdul Nayeem - Arabs of

Hadramut and Hyderabad (India), Relations during 18th - 20th Centuries Pg. 31

۸) Dr. Muhammad Abdul Nayeem - Arabs of Hadramut and Hyderabad (India), Relations during 18th - 20th Centuries Pg. 32

۹) Dr. Muhammad Abdul Nayeem - Arabs of Hadramut and Hyderabad (India), Relations during 18th - 20th Centuries Pg. 36-37

۱۰) Dr. Muhammad Abdul Nayeem - Arabs of Hadramut and Hyderabad (India), Relations during 18th - 20th Centuries Pg. 32

۱۱) Dr. Muhammad Abdul Nayeem - Arabs of Hadramut and Hyderabad (India), Relations during 18th - 20th Centuries Pg. 32

۱۲) Dr. Muhammad Abdul Nayeem - Arabs of Hadramut and Hyderabad (India), Relations during 18th - 20th Centuries Pg. 32-34

۱۳) William Arvine, The Army of the Moghals Pg. 164-165

۱۴) غلام حسین جوہر، گلزار آصفیہ، ص108

۱۵) ابوالفتح امیر اللہ، تاریخ دکن، ص107

۱۶) غلام امام خاں، ہجر، تاریخ رشید الدین خانی، ص374-375

۱۷) ڈاکٹر ثمینہ شوکت، مہاراجہ چندولال

۱۸) Dr. Muhammad Abdul Nayeem, Hyderabad under Salarjung, Pg. 106

۱۹) مکتوب بخدمت نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع

۲۰) Dr. Muhammad Abdul Nayeem - Arabs of Hadramut and Hyderabad (India), Relations during 18th - 20th Centuries Pg. 39

۲۱) نواب مشتاق احمد خاں، مسلمانوں کا دوسرا غرناطہ، حیدرآباد، اردو ڈائجسٹ، ستمبر 1976، ص77، لاہور

۲۲) بحوالہ مکتوب بخدمت نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع، ص10

OOO

Walashan Major General Prince Azam Jah Bahadur

Commander in Chief State Forces

سلطان عمر بن عوض شمشیر نواز جنگ القعیطی ،نواب محمد بن صلاح شمشیر یاور جنگ القعیطی

سلطان عمر بن عوض شمشیر نواز جنگ ،نواب محمد بن صلاح شمشیر یاور جنگ

دائیں سے بائیں: نواب محمد بن صلاح شمشیر یاور جنگ ،نواب صلاح بن محمد شمشیر یاور جنگ القعیطی جمعدارنِ عروب

مضمون

اسیم کاویانی

ابرار رحمانی کی اداریہ نویسی: ایک جائزہ

اس وقت ابرار رحمانی صاحب کی تازہ وارد کتاب 'اداریہ نویسی اور میرے اداریے' میرے پیشِ نظر ہے ،جو اُنھوں نے ماہ نامہ 'آج کل' کے تقریباً چھے برسوں کے عہدِ ادارت میں تحریر کیے تھے۔ یہ ایک خوش آیند امر ہے کہ اب ادبی رسالوں کے اداریوں، کالموں اور شذرات کے انتخابات اور مجموعوں کی اشاعت پر بھی توجہ کی جارہی ہے۔

مُدیر نے اپنی کتاب کے آغاز میں کتاب ہی کا ہم عنوان جو مقالہ بطورِ مقدمہ پیش کیا ہے، اُس میں بڑے کام کی باتیں ہیں اور ہمارے نوجوان صحافیوں کے لیے غور سے پڑھنے کے لائق ہیں۔ کہنہ مشق مُدیر نے بجا طور پر لکھا ہے کہ 'رسالہ یا اخبار نکالنا بہت آسان ہے، لیکن اخبار یا رسالے کے مطالبات یا تقاضے پورے کرنا آسان نہیں'۔

اس مقدمے کے چند خاص نکات یہ ہیں کہ کسی جریدے یا اخبار کا اداریہ محض خانہ پُری کی شے نہیں، بلکہ وہ اس جریدے یا اخبار کے مقصد و مزاج کا آئینہ ہوتا ہے۔ مُدیر کا کردار ایک گائڈ یا رہنما کا سا ضرور ہوتا ہے، لیکن یہ احتیاط ضروری ہے کہ وہ ناصح مطلق بننے کی کوشش نہ کرے اور مختلف مذاق قارئین کے احساسات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے معروضات کو سلیقے سے پیش کرے اور قاری پر اپنی رائے مسلط کرنے کی کوشش نہ کرے۔ مدیر کے لیے دیانت داری، حق گوئی اور غیر جانب داری کو مقدم رکھنا بھی لازم ہے گویا ایک مدیر کا منصب بھی ایک طرح سے منصف کا سا ہے اور چونکہ وہ اپنے قارئین کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے، اس لیے اسے انصاف سے کام لینے کے لیے سخت فیصلوں سے بھی گریز نہیں کرنا چاہیے۔

اس کے علاوہ انھوں نے اردو کی ادبی صحافت کی قابلِ رحم حالت کا جو نقشا کھینچا ہے، اس سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے بہت کم مدیر اور پبلشر کسی واضح نظریے، انتظامی صلاحیت، مالی فراغت اور ادبی اہلیت کے ساتھ میدانِ ادب میں آتے ہیں، ایسے میں وہ اداریہ نویسی کے تو کیا اپنے جریدے کے لیے خاطر خواہ مواد کو جٹانے اور سلیقے سے پیش کرنے میں بھی ناکام نظر آتے ہیں۔ ادھر باذوق قاری بمقتضائے زمانہ زندگی بخش اور نُدرت کے حامل ادب کے لیے ترستا ہے تو اُدھر بے سمت اور بے رس رسائل اپنے لیے قاری نہ جٹا پانے پر نالہ کناں نظر آتے ہیں۔ گویا اُسے کشتی نہیں ملتی اِسے ساحل نہیں ملتا۔

مصنّف نے اداریہ نویسی کے ابتدائی نقوش پر گفتگو کرتے ہوئے کئی ادبی جرائد کا ذکر کیا ہے۔ پھر 'نگار' سے 'نیرنگِ خیال' کے موازنے کو خارج از امکان قرار دیتے ہوئے بھی اُس پر خاص توجہ کی ہے، جب کہ 'نگار' علمی و ادبی ہی نہیں سیاسی، سائینسی اور مذہبی موضوعات پر بھی محیط ہوا کرتا تھا اور اُس کا حریف صرف مذہبی امور میں 'معارف' تھا۔ 'نگار' اور 'معارف' میں معرکہ آرائی بھی چلتی رہتی تھی۔ 'ساقی' اور 'نیرنگِ خیال' کے مشمولات میں شعرو افسانہ اور عوام پسند مواد کا غلبہ ہوتا تھا۔ ان جریدوں میں عموماً اور 'نیرنگ خیال' میں خصوصاً آرٹ پیپر پر رنگین تصاویر کا اہتمام رہا کرتا تھا۔ اُس کے مدیر حکیم یوسف حسن اپنے جریدے کی اشاعت سے کئی برس پہلے سے مطب چلاتے تھے اور ان کے خاندانی دواخانے کے مجرّبات میں مردانہ کمزوری اور جنسی امراض کا علاج بھی شامل تھا، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے رسالے پر خوب خرچ کیا کرتے تھے (ماخذ: 'نیرنگِ خیال')، ورنہ عام طور پر ادبی جریدوں کی دنیا

میں کسی راوی نے چین ہی چین نہیں لکھا۔اس کتاب کے کئی ابواب کے آخر میں دیے گئے fillers سے ہمیں 'زمانہ' جیسا رسالہ اپنی خستہ حالی اور خسارے کی فریاد کرتا نظر آتا ہے۔

ابرار صاحب نے بجا طور پر نیاز کے اداریوں کو سراہا ہے جو کہ 'ملاحظات' کے عنوان سے 'نگار' میں شائع ہوا کرتے تھے۔ ان اداریوں میں نہ صرف برّصغیر کی تقریباً نصف صدی کے سیاسی، معاشرتی، ملّی اور (کسی حد تک) ادبی نشیب و فراز کی تاریخ محفوظ ہے بلکہ ان میں بین الاقوامی سیاست کا مدّ و جزر بھی دیکھا جاسکتا ہے۔'نگار' کی اور کئی خصوصیات کے ساتھ اس باب میں بھی کوئی اور اردو جریدہ اُس کا حریف نہیں تھا۔اداریوں کے جمع و ترتیب کا اولین نقش بھی غالباً سب سے پہلے نیاز ہی نے قائم کیا تھا جب 'نگار' کا جنوری فروری 1933ء کا خاص نمبر 'نگار' کے گذشتہ برسوں کے منتخب اداریوں پر مشتمل 'ملاحظات نمبر' کی صورت میں پیش کیا گیا تھا... ایک زمانے کے بعد 'نگار' کے ایک ہم عصر ماہنامے 'ندیم' (گیا) کے اداریوں کے دو مجموعے خدا بخش (پٹنہ) نے 'نظرات' اور 'شذرات' کے ناموں سے 2004ء میں شائع کیے تھے۔

برسوں پہلے روزنامہ 'انقلاب' (بمبئی) میں ظ.انصاری کے لکھے اداریوں کا مجموعہ 'کانٹوں کی زبان' کے نام سے شائع ہوا تھا۔' اس کے علاوہ جون ایلیا کے ماہ نامہ 'انشا' (کراچی) اور مختلف جرائد میں لکھے ہوئے اداریے اور افتتاحیے جو کہ اچھے خاصے انشائیے اور مضمونچے ہوا کرتے تھے، اُن کے انتقال کے بعد 'فرنود' نامی ایک ضخیم کتاب کی صورت میں شائع ہو چکے ہیں......ادھر پچھلے دو برسوں میں ادبی اداریوں کے چار اہم مجموعے اور منظر عام پر آئے ہیں۔سہ ماہی 'اردو ادب' کے مُدیر اسلم پرویز کے اداریوں کا مجموعہ 'پہلا ورق'، سہ ماہی 'نیا ورق' (بمبئی) کے مُدیر ساجد رشید کے اداریوں کا مجموعہ 'دستخط'، 'معارف صدی کے موقع پر اس جریدے میں شائع شدہ منتخب ادارتی 'شذرات' پر دو حصّوں پر مشتمل 'معارف' کا خصوصی نمبر اور 'آج کل' کے اڈیٹر ابرار رحمانی کے اداریوں کا پیشِ نظر مجموعہ، جس کا یہاں تفصیلی جائزہ لیا جا رہا ہے۔ہاں، ظفر ہاشمی مدیرِ 'گلبن' کے اداریوں کا مجموعہ بھی چھپ چُکا ہے۔اس وقت یہی چند نام دھیان میں آرہے ہیں۔

ابرار صاحب کی اردو فکشن کی رفتارِ ترقی پر گہری نظر ہے، یہی وجہ ہے کہ اردو فکشن اور فکشن نگاروں پر اُن کے لکھے ہوئے کوئی پندرہ سولہ اداریے اس کتاب میں شامل ہیں۔ وہ اردو افسانے میں پریم چند کی تاج داری کے قائل ہیں اور پریم چند کا ذکر جہاں بھی آیا ہے، اُن کی کیفیت 'میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے' کی سی ہوگئی ہے۔اردو افسانے کے اس لیجنڈ کی 125 ویں سال گرہ کے موقع پر لکھے اداریے میں اُنھوں نے بتایا ہے کہ پریم چند کے حبِّ وطنی کے جذبات سے مملو افسانوں کے مجموعے 'سوزِ وطن' کو انگریزوں نے اپنے مفاد کے خلاف جان کر بغیر کسی ضابطے کے ضبط کرلیا تھا اور یہ واقعہ پریس انڈیا ایکٹ کے تحت ضبطی کے قانون کی تشکیل کا محرک بنا تھا۔اپنے ایک دوسرے اداریے (بابتہ اکتوبر 2006ء) میں اُنھوں نے اطلاع دی ہے کہ پریم چند نے مصلحتاً 'ن ر'، 'در' (نواب رائے اور دھنپت رائے۔اسیم) اور 'بمبوق' کے فرضی ناموں سے لکھنا شروع کردیا تھا۔

اپنے ایک سابقہ اداریے (بابتہ مارچ 2003ء) میں مدیر نے اردو افسانے کی زار و زبوں حالت کو موضوع بنایا تھا اور اردو افسانے پر منعقد ہونے والے سیمی ناروں کو بوجوہ بے نتیجہ قرار دیا تھا۔اُنھوں نے اردو افسانے کی زوال پذیری پر یوں تبصرہ کیا تھا کہ '...آج بھی جب فکشن کی بات ہوتی ہے تو...بلراج مین را، سریندر پرکاش، قرۃ العین حیدر اور جوگندر پال تک آتے آتے ہماری سانس پھولنے لگتی ہے۔' اور یہ کہ وہ دورِ حاضر کے اردو افسانوں میں کہانی پن سے مطمئن ہیں نہ ہی کردار نگاری سے۔اگست 2010ء کے شمارے میں اُنھوں نے ایک بار پھر اردو فکشن کا کڑا محاسبہ کیا تھا اور

لکھا تھا کہ ’...لگتا ہے آج بھی پریم چند، منٹو، بیدی، عصمت اور کرشن ناقابل عبور چٹانوں کی طرح کھڑے ہیں۔‘ اسی شمارے میں قیصر تمکین کا ایک نصف صدی قدیم مضمون ’آج کا اردو افسانہ‘ بھی شامل تھا، جس کے حوالے سے مدیر نے طعنہ دیا تھا کہ اُس مضمون میں گنوائے گئے چالیس ناموں میں آج بھی کسی افسانہ نگار کا اضافہ کرنا مشکل نظر آتا ہے، غالباً عابد سہیل، جوگندر پال، جیلانی بانو اور اقبال متین کے بعد اردو افسانے کا سفر تھم سا گیا ہے اور داستانوی عہد سے نکلنے کے بعد اردو افسانہ اپنے دور اوّل و دوم (عہدِ پریم چند و مابعد پریم چند) کے بعد کوئی ارتقا نہیں کر سکا۔ سیاسی تحریک اور رجحانِ نو (ترقی پسند تحریک اور جدیدیت) کے نام لیوا ٹین کے خالی ڈبّے کی طرح ڈھن ڈھن کر رہے ہیں‘ (ص:113)۔ ان کی یہ رائے جارحانہ تو ضرور ہے لیکن تواتر کے ساتھ غیر معیاری تخلیقات کا سامنا کرنے والے مدیر کی برہمی کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان کے اس اداریے پر بڑا سخت ردِ عمل سامنے آیا تھا، جس میں مشرف عالم ذوقی کے سُر سب سے اونچے تھے، لیکن اُنھوں نے کسی کی پروا کیے بغیر اپنے جارحانہ تیوروں کے ساتھ (’آج کل‘ اکتوبر 2010ء میں) جدید تر لکھنے والوں کی نگارشات کو خس و خاشاک کا ڈھیر قرار دیا تھا اور لکھا تھا کہ ’ہمیں انبار نہیں شاہکار چاہیے۔‘ گویا ؎

بزمِ ساقی میں دیدنی ہے سماں
خم ِ لبریز و جامِ خالی کا

پریم چند کو اردو افسانہ نگاری کا گوہرِ نایاب قرار دیتے ہوئے اُنھوں نے یہ دل چسپ انکشاف بھی کیا تھا کہ جارج آرویل کا مشہور انگریزی ناول Animal Farm دراصل پریم چند کی ’دو بیلوں کی کہانی‘ پر مبنی ہے جو کہ اس ناول سے چودہ پندرہ برس پہلے چھپ چکی تھی۔ یوں ایک طرح سے مغرب نے بھی اُن کے فن سے روشنی حاصل کی ہے۔

پاکستانی فکشن نگاروں میں اُنھوں نے احمد ندیم قاسمی، شوکت صدیقی، ابنِ صفی اور ہاجرہ مسرور کو موضوعِ قلم بنایا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے وفاتیے میں مدیر نے لکھا تھا کہ وہ ایک افسانہ نگار، شاعر اور صحافی تینوں ہی حیثیتوں سے مشہور تھے۔ بقول ابرار صاحب، قاسمی پریم چند کی روایات کے سچے امین تھے۔ مزید یہ کہ اگرچہ قاسمی مرحوم نے ’امروز‘، ’ادبِ لطیف‘، ’سویرا‘، ’نقوش‘ کے مدیر اور ’فنون‘ کے بنیاد گزار مدیر کے طور پر بھی خاصی مقبولیت حاصل کی تھی، لیکن انھیں ادیب و شاعر کی حیثیت سے پہچانا جانا زیادہ پسند تھا، وجہ ظاہر ہے کہ وہ صحافت کو ادب سے کم تر سمجھتے تھے۔ ’آج کل‘ نومبر 2006ء میں قاسمی پر گوشہ پیش کرتے ہوئے اُن کے کوائف پر یوں اور روشنی ڈالی گئی ہے کہ وہ صدر ایوب خان کے دورِ حکومت کے معتوبین میں شامل تھے اور اُنھوں نے سی کلاس کی صعوبتوں کو بھی جھیلا تھا۔

ابنِ صفی پر لکھے اپنے اداریے میں مدیر نے ادب کی دنیا میں جاسوسی فکشن کی کم وقری کی شکایت کی ہے اور اُن کی تحریر ابنِ صفی کی ہر دل عزیزی کے گن گان پر محیط ہے۔ راقم کا بھی یہی خیال ہے کہ جب سیکڑوں کم معیاری، غیر معیاری بلکہ مریضانہ رومانی و سماجی ناول تک محض ادب کے معروف مصنّفوں سے منسوب ہونے کے سبب سے ہمارے ادب میں شامل ہیں تو ابنِ صفی کے جاسوسی ناولوں کو ادب باہر قرار دینا مناسب نہیں۔

شوکت صدیقی پر وفاتیہ اداریے کو ’اردو بستی کا خدا‘ کی سُرخی دے کر مدیر نے اُن کے مشہور و مقبول ناول ’خدا کی بستی‘ کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ یہ عام بول چال کی زبان میں لکھا، تجسس بھرے واقعات سے پُر ناول پاکستانی معاشرے کے اعلا و ادنا دونوں طبقوں کا ترجمان اور اپنے زمانے کا نوحہ ہے۔ وہیں ہاجرہ مسرور کے وفاتیے میں مدیر نے صاف گوئی سے بے لاگ لپیٹ لکھ دیا ہے کہ ’ویسے بھی وہ زندہ کب تھی! پچھلے چالیس سال سے وہ زندہ

لاش کی مانند زندگی گزار رہی تھی۔' مزید یہ کہ 'ڈان' کے مدیر احمد علی سے شادی کے بعد وہ خاتونِ خانہ بن کر رہ گئی تھی اور شاید وہ شادی بھی اُسے راس نہیں آئی تھی۔(ص:200)

'آج کل' کے جون 2011ء کے شمارے میں مدیر نے جاسوسی اور سائینسی ناولوں کے لیے مشہور اظہار اثر کی رحلت پر پُر اثر اداریہ سپردِ قلم کیا ہے۔ رقم طراز ہیں 'جاسوسی فکشن اظہار اثر کا شوق، شغف، جنون، پیشہ، ضرورت سبھی کچھ بن گیا تھا، جس کے تحت ان کا قلم زود نویس اور بسیار تحریر ہو چلا تھا' (ص:144)۔ مدیر نے اس کثیر تصانیف ادیب کے ایک ہزار ناولوں، دو سو سائینسی مضامین، تین سو افسانوں کے اعداد پیش کرتے ہوئے اُن کے ڈراموں، ادبی مضامین اور 'اظہار اثر ڈائجسٹ'، 'رات کا رپورٹر' اور 'ہم قلم' وغیرہ جریدوں کی ادارت، شعری مجموعے 'لاشریک' اور ادارہ 'شمع' کے ماہانہ جریدے 'مجرم' کے لیے 'قانون والا' کے فرضی نام سے ناول لکھنے کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ مزید برآں 76-1975ء میں لوگوں نے کثیر معاوضے پر اُن سے ٹیلی ویژن کے لیے اپنے نام سے سیریل بھی لکھوائے تھے، (ص:146)۔ اظہار اثر کی گھوسٹ رائٹنگ میں معاوضہ لے کر لوگوں کو افسانے اور غزلیں لکھ کر دینے کا انکشاف بھی کیا گیا ہے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ اُن کی غزلوں کا ایک مجموعہ 'بشارت' کے نام سے آیا تھا اور اُن کے سوانحی حالات میں کہیں پڑھنے میں آیا ہے کہ اُنھوں نے کئی برس تک شاستریہ نرتیہ کلا (کتھک، کتھا کلی وغیرہ) کی تربیت بھی حاصل کی تھی اور اسٹیج کو بھی اپنایا تھا۔ غرض کہ اظہار اثر نے اپنی ہشتاد سالہ عمر میں بڑی فعال زندگی گزاری تھی۔ بہرکیف اُن کی بسیار نویسی کی تعداد خاصی مبالغہ آمیز ہے اور اُن کے نام سے چھپے ناولوں کی تعداد بھی دو سو سے زیادہ نہ ہوگی۔

'آج کل' مئی 2012ء کا اداریہ ڈپٹی نذیر احمد اور منٹو کے لیے وقف کرتے ہوئے مدیر نے یہ وجہ اشتراک ڈھونڈ نکالی ہے کہ مئی 1912ء میں اردو فکشن کا سب سے اہم اور اوّلین نام ڈپٹی نذیر احمد کا اس جہانِ فانی سے کوچ ہو رہا تھا، دوسری طرف اردو فکشن کی سب سے متنازعہ شخصیت منٹو کا ورد ہو رہا تھا، (ص:179) یہاں پر اس نکتۂ افتراق کا ذکر بھی کیا جانا چاہیے تھا کہ نذیر احمد کے ناصحانہ ناولوں کی دنیائے اخلاقیات میں آتش و شرر کا ادب بھی نارِ جہنم کی چنگاریوں کا حامل ہے، جب کہ منٹو کا سلگتا ہوا قلم اخلاق باختہ کرداروں میں بھی انسانیت کی رمق ڈھونڈ کر زندگی کی حرارت بھرتا رہا تھا۔ ترقی پسند تحریک کے پچھتر سال پورے ہونے کی تقریب سے انھوں نے اپنا ایک اداریہ روسی ادب کے دو انتہائی اہم افسانہ نگاروں چے خف اور گوگول کی نذر کیا تھا اور اِن فنکاروں کی عالمی اہمیت و مقبولیت کے اسباب واضح کیے تھے۔

ایک زمانے میں دہلی کے مشہور ادیب و افسانہ نگار فضل حق قریشی نے طاہرہ دیوی شیرازی کے فرضی نام سے جذبات برانگیختہ کرنے والے افسانے لکھ کر کافی ہلچل مچائی تھی اور کئی مشہور ادیب طاہرہ کے غائبانہ عشق میں گرفتار ہو گئے تھے۔ 'آج کل' کے اگست 2012ء کے پرچے میں اسی کی رودادِ رنگیں پر چند مضامین شامل تھے۔ موضوع نے ایسا رنگ جمایا ہے کہ اداریے میں بھی لرزشِ رفتارِ خامہ سے مستیِ تحریر چھلک رہی ہے۔

غالب اور اقبال اور سبھوں کی طرح ابرار صاحب کی بھی پہلی پسند ہیں۔ ایک اداریے میں غالب کے نام پر بپا تقریبات اور رونقیں دیکھ کر یوں چٹکی لی ہے کہ '......اسی غالب نے زندہ رہتے اپنی ضروریاتِ زندگی کے لیے کیا کیا جتن نہیں کیے! اُس کی یاد میں احباب پلاؤ کھا رہے ہیں اور قبر پر فاتحہ خوانی کر رہے ہیں۔' اِسی کے ساتھ انھوں نے غالب کے نام پر ہونے والی غیر ضروری اور کوہ کندن کاہ برآوردن جیسی تحقیقات سے بیزاری کا اظہار بھی کیا ہے۔ مارچ 2011 کے اداریے میں وہ بڑے کام کی بات کہہ گئے ہیں کہ غالب اپنے ایک مختصر اور سبک سے دیوان کے

باوجود سب پر غالب ہے۔کاش! آج دس دس بیس بیس شعری مجموعوں کے شعرااس نکتے پرغور کرسکتے!(ص:133)

غالب کی رجائیت کے ساتھ ساتھ وہ اقبال کی رجعت پسندی پربھی یکساں طور پر فدا ہیں۔اکثریتی اقبال پسندوں کی طرح انھوں نے بھی اقبال کے ابتدائی دور کے'ترانہء ہندی' کے عوض اُن کی آخری دور کی وطنیت بیزاری (بحیلہء ہجرت ِ رسول ،بحوالہ:Stray Thoughts)،عملی زندگی کی سیاسی کج روی، نظریاتی نااستواری اور برہمن زادگی کی شرم ساری(بحوالہ'زندہ رود') کے کردہ گناہوں کوبخش دیا ہے۔مختصر یہ کہ اقبال پراُن کے فرمودات ع 'چلوتم اُدھر کو،ہوا ہو جدھر کی' کے مصداق ہیں۔بہرکیف'آج کل' کےنومبر 2010 کے اداریے میں ٹیگوراوراقبال کے تعلق ایک واقعہ درج کرنے کے لیے ہم اُن کے ممنون ہیں،جہاں اقبال یہ بھول بیٹھے تھے کہ مجرّدکوئی زبان نہیں بلکہ اس زبان کو استعمال کرنے کی قدرت زیادہ اہم ہوا کرتی ہے۔جس پنجابی زبان کو انھوں نے کم مایہ سمجھا تھا،اسی پنجابی میں وارث شاہ'ہیررانجھا' جیسا شاہ کارتخلیق کرگیا تھا۔وہ اقتباس یوں ہے:

'ٹیگور نے اقبال سے اپنا موازنہ نہ کرنے کی صلاح دیتے ہوئے کہا تھا کہ میں اپنی مادری زبان بنگلہ میں لکھتا ہوں،جب کہ وہ اپنی زبان پنجابی میں نہ لکھ کراردو میں لکھتے ہیں۔جواب میں اقبال نے کہا تھا کہ اُن کی زبان پوری طرح ترقی یافتہ ہے جب کہ میری نہیں۔جواب میں ٹیگور نے کہا کہ میری زبان ترقی یافتہ نہیں تھی بلکہ میں نے اسے ترقی یافتہ بنایا۔'(ص:121)

اِس کے علاوہ شعروادب اوراردومعاشرے سے تعلق رکھنے والی تیس کے قریب اورشخصیات بھی ہیں،ان کو،کسی کی برسی تو کسی کی سال گرہ یاکسی کے رحلت کرجانے پراِن اداریوں کا موضوع بنایا گیا ہے۔مدیرنے'آج کل' کے ایک پیچی اداریوں میں اس خوبی کے ساتھ اُن کے سوانحی کوائف اورعلمی وادبی کارناموں کوسمیٹا ہے جیسے گاگر میں ساگر۔اِس ضمن میں نقاداورڈراماٹسٹ ڈاکٹرمحمدحسن،دلّی کے البیلے اور کرخنداری لب و لہجے کے شاعرشجاع خاور،مفکرونقاد دیویندر اسّر ،محقق و ماہرلسانیات مسعودحسین خان،حکیم و رہبرملت حکیم عبدالحمید،مفکرومصلح اصغرعلی انجینئر کے وفاتیے اورخدائے سخن میرتقی میرکی دوسویں برسی اورترقی پسند تحریک کے بانی سیدسجادظہیر،مارکسی نقاداحتشام حسین،ہشت پہلونقادآل احمدسرور،رومانوی شاعرمجاز اورشاعرِانقلاب فیض کی سوویں سال گرہ پر لکھے ہوئے اداریے ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔ان اداریوں میں بقدرضرورت جہاں تہاں مدیرنے اپنے متوازن نقدوتبصرے سے بھی کام لیا ہے اور یہ بات ان اداریوں کو اس نوع کی تاثراتی اورخراجِ عقیدت کی عام تحریروں سے قدرے مختلف بنادیتی ہے۔مثلاً حکیم عبدالحمید کی زندگی اور کارناموں پر شائع ہونے والی کتابوں میں چند ایک حضرات نے اُنھیں جس طرح سرسید ثانی کے خطاب سے نوازا ہے، مدیر نے اس سے عدم اتفاق کا اظہار کیا ہے۔فیض پر لکھے اداریے میں ہمیں یہ دل چسپ اطلاع ملتی ہے کہ فوج میں کرنل کے عہدے تک پہنچنے والے فیض کوصحافت سے خاص لگاؤ تھا اور 'پاکستان ٹائمز'(کراچی)'لوٹس'(ماسکو،لندن،بیروت)،روزنامہ 'امروز'(کراچی)اورہفتہ وار'لیل ونہار'(لاہور)کی ادارت سے وابستہ رہا یہ انقلابی شاعرخودکو(احمد ندیم قاسمی کے برعکس)بطور صحافی متعارف کرانے میں فخرمحسوس کرتا تھا۔مزید یہ کہ فیض کی وفات سے کچھ روزقبل انھیں نوبل انعام کے لیے نامزدکیا گیا تھا، اگر وہ حیات رہتے تو نہ صرف اُنھیں بلکہ اردوزبان کوبھی پہلانوبل پانے کااعزازمل جاتا۔ایک اداریے میں مولانامحمدحسین آزادکویوں خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے کہ'آبِ حیات' محمدحسین آزادکا شناخت نامہ ہے'،ساتھ ہی یہ کہنے سے بھی گریزنہیں کیا گیا کہ'تعصب،تحقیق کی کمی اور انشا پردازی آزاد کی تنقید کو مجروح کرتے ہیں'(ص:76)۔دیوندر اسّر کی موت کے المیے پر مدیر

نے اردو دنیا کی بے حسی پر تازیانہ لگایا تھا کہ 6 نومبر 2012 کو گزر چکے اسّر کی موت کی خبر دو ہفتے تک کسی کو نہ ہو سکی تھی۔ ترقی پسند تحریک کے پچھتر سال پورے ہونے پر مدیر نے بے رو رعایت لکھ دیا تھا کہ 'مجروح سلطان پوری نے کہا تھا کہ لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا، لیکن یہاں معاملہ کچھ اُلٹا ہی نظر آتا ہے اور کارواں بٹتا، بکھرتا اور منتشر ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔' اُنھوں نے یہ تلخ سوال بھی اُٹھایا تھا کہ کیا یہ تحریک اب بھی زندہ اور فعال ہے؟

کہیں کہیں مدیر کا قلم لحاظ و مروّت کا شکار بھی ہوا ہے، مثلاً: 'آل احمد سرور پر کوئی لیبل چسپاں کرنا آسان نہیں۔ وہ رومانیت، ترقی پسندی اور جدیدیت کا حسین امتزاج نظر آتے ہیں۔' (ص: 199)، جیسا کہ ہم جانتے ہیں یہ تحریکیں ایک دوسرے کے ردِّعمل میں رونما ہوئی تھیں، مدیر کا تبصرہ آل احمد سرور کے ضرورت سے زیادہ لچک دار اسلوب اور غیر مستحکم تنقیدی مزاج کے نقص کو حسین بنانے کی ایک ناکام کوشش کے سوا کیا ہے! اگر آپ مارکسی طرزِ فکر کے مخالف ہیں تو احتشام حسین کو یک قلم مسترد کر سکتے ہیں، لیکن آل احمد سرور کا مطالعہ اکثر اُمور میں قاری کو کسی نتیجے پر نہیں پہنچاتا اور وہ کہہ اٹھتا ہے 'ہائے میں کیا کروں، کدھر جاؤں!' مجاز کے سلسلے میں مدیر کا یہ اشارہ تفصیل کا محتاج نظر آتا ہے کہ: 'آج کل' کے سب اڈیٹر جذبی نے نورا کے ساتھ مجاز کے عشق کو بڑھاوا دیا۔' (ص: 157) اردو والے تو بس اتنا جانتے ہیں کہ مجاز نے اپنی علالت کے دوران نورا نامی نرس کے حسنِ خدمت اور اُس کے لیے اپنے عاشقانہ جذبات کو اپنی ایک نظم 'نورا' میں منتقل کر دیا تھا۔

'آج کل' کے چند اداریے اپنے سلگتے ہوئے موضوعات کی بنا پر خاصے اہم ہیں۔ ان میں اردو ادیبوں میں ٹھپّہ فکیٹ کے لینے اور دینے کی روایت، کم عیار کتابوں اور جریدوں کی بھرمار، اردو میڈیم اسکولوں کے مسائل اور لیلائے تحقیق کے وصل میں سہل انگار ادیبوں کی نارسائی کو موضوع بنایا گیا ہے اور بڑی دل سوزی اور جرت کے ساتھ تلخ حقائق بیان کیے گئے ہیں۔ شاید ایسے ہی کسی اداریے کو پڑھ کر ان کے جریدے کے کسی ستم ظریف قاری نے اسے ایک پیچی توپ سے تعبیر کیا تھا۔ ان اداریوں کا لبِّ لباب ہم اپنے الفاظ میں بیان کرنا چاہیں تو مدیر نے توجہ دلائی ہے کہ آج کا لکھنے والا تحقیق و تنقید کی دشواریوں کا مکلّف ہوئے بنا مردِ میداں بن جانا چاہتا ہے گویا ع ہر ناقص اپنے زعم میں صاحب کمال ہے۔ نتیجتاً وہ اپنے اساتذہ اور پروفیسروں سے ستایشی سرٹیفکیٹ، پیش لفظ، تقریظ، مقدمہ یا فلیپ یا پشت کی عبارت کی شکل میں لکھوالیتا ہے اور اس کے عوض میں اپنے محسن کو اپنی کتاب معنون کرتے ہوئے اس کی تحسین و تعریف میں غلو کی حدیں پار کر جاتا ہے۔ اس طرح کے لین دین کا نامناسب چلن ہمارے ادب میں جڑ پکڑتا جا رہا ہے۔ تحقیق کی زبوں حالی پر مدیر نے اپنے مشاہدے کی بنا پر تحریر کیا ہے کہ کس طرح قدما کی تحقیقات پر دھڑلّے سے ہاتھ صاف کیا جا رہا ہے یا معاوضہ دے کر لکھوایا جا رہا ہے اور چبائے ہوئے نوالے پیش کیے جا رہے ہیں گویا ع سنا رہے ہیں وہ قصّے جو ہیں سنائے ہوئے۔ طرفہ تماشا یہ کہ انھیں من چاہے اکزامنر بھی مل جاتے ہیں اور سندیں بھی۔ اس کے علاوہ ہمارے بزرگ فنکار جو ضعف العمری کی بنا پر تخلیقی جوہر سے خالی ہو گئے ہیں کس طرح نو واردانِ ادب کو خود اپنے ادبی کارنامے ڈکٹیٹ کرا کے مقالے لکھوا رہے ہیں۔ (حال ہی میں ممبئی کے ایک ساز پر نوا پرداز ایک خاتون کی ڈاکٹریٹ کچھ ایسے ہی ساز باز کا نتیجہ ہے۔ اسیم) یہی حال انعامات کی بندر بانٹ کا ہے۔ شہرت طلبی کے مرض نے رسالوں کے گوشوں اور نمبروں کی خرید و فروخت کا الگ بازار پیدا کر دیا ہے۔ سنجیدہ مذاق قاری ایسے رسالوں کو دیکھتے ہی سمجھ جاتا ہے کہ ع نہ قول اعتماد کا، نہ بات اعتبار کی۔ انگریزی تعلیم کی چاہ میں اردو میڈیم اسکولوں کو نظر انداز کیے جانے کا انھوں نے یوں محاسبہ کیا ہے

کہ دراصل ہم اردو کی طرف سے مایوسی اور احساس کمتری کا شکار ہیں جب کہ دنیا کی چھوٹی زبانوں کو بھی اُن سے پیار کرنے والوں نے زندہ رکھا ہوا ہے۔اس کی مثال میں انھوں نے اسی سال2002 ء میں ہنگری (ہنگرین ! اسیم) زبان کے ادیب امرے کرتیز کو نوبل دیے جانے کی اطلاع دی ہے، جب کہ اس زبان کے بولنے والے اردو سے بھی کم ہیں۔

نوبل انعامات پر اُن کے چھے اداریے ملتے ہیں جنھیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اُنھوں نے اپنا ہر اداریہ لکھنے سے پہلے ان انعامات کی تاریخ، پس منظر اور ان سے متعلق عالمی بحثوں سے کتنی آگہی حاصل کر لی تھی۔

اپنے ایک اداریے میں انھوں نے اس عالمی تشویش کا اظہار کیا ہے کہ ادب کا نوبل انعام اب کسی مصنف کی تخلیقی اہمیت کی بجائے اس کے مخصوص سیاسی رجحان کی بنا پر تو نہیں دیا جا رہا ہے! اس ضمن میں انھوں نے ماضی کے ایسے انعام یافتگان کی مثالیں پیش کی ہیں جو کہ اپنے ملک وحکومت کے مخالف اور معتوب رہے تھے۔کسی اداریے میں بنگلا دیش کے محمد یونس اور اُن کے گرامین بینک کو مشترکہ طور پر امن کا نوبل پرائز ملنے کی پذیرائی کی گئی ہے کہ اُنھوں نے ہزاروں غریبوں کو مائکروفائنانس اسکیم کے تحت قرض فراہم کرکے خود کفیل ہونے میں مدد دی تھی تو کہیں اس بات پر حیرت کا اظہار کیا گیا ہے کہ براک اوبامہ کے امریکی صدارت سنبھالتے ہی انھیں اسی سال اتنی جلد امن کے نوبل انعام کا مستحق کیسے سمجھ لیا گیا؟

مدیر نے اس بات پر کئی جگہ افسوس کا اظہار کیا ہے کہ جو باوقار نوبل انعامات مختلف شعبوں میں ایمان داری اور لگن کے ساتھ کارہائے نمایاں انجام دینے کے محرک بنے ہیں وہ تنازعات میں بھی گھرے رہے ہیں۔' آج کل' کا نومبر 2011ء کا اداریہ 'نوبل انعامات کے تنازعات' ہی سے متعلق ہے۔انھوں نے لکھا ہے کہ ان انعامات کے انتخاب میں سیاست، جوڑ توڑ اور یورپ نوازی حاوی ہوتی جارہی ہے اور کچھ ایسی ہی وجوہ کی بنا پر ژاں پال سارتر نے 1964ء میں ادب کا نوبل اور ڈک تھوتھے نے 1973ء میں امن کا نوبل انعام لینے سے انکار کر دیا تھا۔

ناروے نوبل کمیٹی نے 2006ء میں اپنے ایک بیان میں مہاتما گاندھی کو نوبل امن انعام نہ دیے جانے کو اِن انعامات کی تاریخ کی سب سے بڑی غلطی قرار دیا تھا اور افسوس ومعذرت کا اظہار کیا تھا۔مدیر نے ایک انگریزی جریدے کے حوالے سے ایسی کئی موقر شخصیتوں کے نام پیش کیے ہیں جن کے لیے نوبل کمیٹی کو مزید معذرت خواہی کی ضرورت پڑسکتی ہے۔مدیر نے کہیں پر اس شکایت کا اظہار بھی کیا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور قرۃ العین حیدر جیسی نابغۂ عصر شخصیتوں کو ادب کا نوبل انعام نہیں دیا گیا، کہیں اس کی وجہ اردو زبان سے تعصب تو نہیں!2013ء میں ٹیگور کو ملے ادب کے نوبل انعام کی صد سالہ تقریب کے حوالے سے مدیر نے یاد دلایا ہے کہ ایک دہائی قبل ٹیگور ہی کے گہوارۂ علم وعمل وشو بھارتی سے وہ نوبل میڈل کئی دوسرے قیمتی سامانوں کے ساتھ چوری ہو چکا ہے اور اس کی بازیابی ہم آج تک نہیں کر سکے، بہتر ہوگا کہ ہم ٹیگور کی وراثتِ علم وعمل اور اُن کے شانتی کے پیغام کی پاس داری کر لیں۔

ایک اداریہ اُنھوں نے قدر ومنزلت کے لحاظ سے نوبل کے بعد اور رقمی اعتبار سے دنیا کے سب سے بڑے بوکر انعام کے بارے میں بھی سپرد قلم کیا ہے، جسے بوکر میک کنل کمپنی نے 1968ء میں جاری کیا تھا۔ 1981ء کا بوکر سلمان رشدی کے ناول 'مڈ نائٹس چلڈرن' کو دیا گیا تھا۔مدیر نے حیرت ظاہر کی تھی کہ 1993ء کا بوکر جوبلی انعام اور 2008ء میں بوکر انعام کے چالیس سال پورے ہونے پر 'دی بیسٹ آف دی بوکر' کا نعام بھی اِسی ناول کو کیسے دے دیا گیا!

ابرار صاحب ایک محتاط قلم مدیر ہیں اور ادبی شخصیات کے ذکر اذکار میں انھوں نے عموماً توازن اور منصفی سے کام لیا ہے، پھر بھی چند مقامات پر اُن کے sweeping remarks قاری کو مغالطے میں مبتلا کر سکتے ہیں۔ اس ضمن میں کم از کم دو اداریے تفصیلی تجزیے کے متقاضی ہیں، اُن ہی سے متعلق سخن ہائے گفتنی کے لیے قارئین کی توجہ درکار ہے۔

(2)

'آج کل' نومبر 2013 کا اداریہ سردار جعفری سے متعلق ہے اور سردار پر ابرار صاحب کی رطب اللسانی سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اُن ہی کے الفاظ اِکٹھے کروں تو وہ... بیسویں صدی کی اہم شخصیات میں سے ایک، مفکر و دانش ور، جامع العلوم یعنی ادیب، شاعر، نثر نگار، تنقید نگار، محقق، افسانہ نگار، ڈراما نگار، مترجم اور صحافی وغیرہ کو ایک خاص پانی اور مٹی سے گوندھ کر بنایا ہوا پُتلا، 'علی' کی طرح جری، حضرت 'جعفر' بن طیار کی طرح ہر موقع کے لیے تیار اور اپنے نام ہی طرح 'سردار' تھے۔ اس کے بعد اُنھوں نے سردار جعفری کی پُرکشش شخصیت کا خاکہ کھینچنے اور اُن کے ادبی کارناموں کی تحمید و تحسین کے لیے ایسا سُندر پیرایۂ اظہار اختیار کیا ہے کہ مجھے فلم 'میرے محبوب' میں ساحر اور ناظمہ کی قوالی کا ٹیپ کا مصرعہ یاد آ گیا ع میرے محبوب میں کیا نہیں ہے!

حقیقت یہ ہے کہ سردار جعفری، ترقی پسند تحریک کے آغاز کے بعد اس سے جُڑنے والے اہم ادیبوں میں سے ایک تھے۔ اُنھوں نے اپنے عہد کے ہنگامہ خیز موضوعات کو اپنی شاعری میں بڑی خوبصورتی اور کامیابی سے برتا تھا اور ایک نسل کو متاثر کیا تھا۔ اُس عہدِ کشاکش میں اس تحریک کو کامیابی سے ہم کنار کرنے سے لے کر، سجاد ظہیر کی موت کے بعد اس تحریک کے رو بہ زوال دور میں بھی اسے فعال رکھنے میں اس رومانی انقلابی سالار کی سعیِ پیہم کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ وہ یقیناً ایک صاحبِ نظر ادیب اور نکتہ سنج شاعر تھے اور جیسا کہ اُن کے معاصرین کا کہنا ہے، وہ ایک بہترین مقرر، مُناظِر اور منتظم بھی تھے۔

اب اِس بارے میں اختلاف رائے ہو سکتا ہے کہ اُن کی شاعری میں تخلیقی وجدان اور پائیدار عناصر کا کتنا حصّہ ہے! تحقیق کا اُنھیں کوئی دعوا نہیں تھا اور اِس بات کا اظہار بھی اُنھوں نے کئی مواقع پر کیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو نقادوں میں شمار نہیں کرتے اور یہ کہ کبیر، میر اور غالب کے جہانِ فکر کی سیر اُنھوں نے خود اپنی شعر گوئی کو نکھارنے کے لیے کی تھی۔ اس لیے ابرار صاحب نے اُنھیں جس طرح ہمہ صفت موصوف اور ہر فن مولا بنا کر پیش کیا ہے، وہ درست نہیں ہے اور اُن کی نقاد، محقق، افسانہ نگار، ڈراما نگار اور مترجم کی نسبتیں ضمنی اور واجبی سی ہیں۔

سردار کے مشہورِ زمانہ مصرعے، 'ہر عاشق ہے سردار یہاں، ہر معشوقہ سلطانہ ہے' سے بات شروع کرتے ہوئے ابرار صاحب نے لکھا ہے کہ 'یہ سلطانہ کی معشوقیت کو بھی نمایاں کرتا ہے اور علی سردار جعفری کے اپنے نصب العین کے تئیں عشق کو بھی ظاہر کرتا ہے۔' (ص: 244)۔ مجرّد اِس مصرعے میں تو سردار کا نصبِ عین بلا شرکت غیرے سلطانہ ہی نظر آتی ہے۔ اب اس سیدھے سادے مصرعے میں اُنھوں نے سردار کے کس نصبِ عین کو کہاں دیکھا ہے، اسے وہ ہی آشکار کر سکتے ہیں۔ اُنھوں نے سردار کی محض ادبی خدمات کی ستایش ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ لکھا ہے:

''یہ محض اتفاق ہے کہ سال 2013ء ہندستانی سنیما کی صدی ہے اور سردار جعفری کی بھی۔ جعفری نے سنیما اور دوسرے ذرائع ابلاغ کے توسط سے اردو زبان اور اپنی قوم کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ ناقابلِ فراموش ہیں... اُنھوں نے کئی ڈاکومنٹری فلمیں بھی بنائیں، نغمے لکھے اور ٹی وی کے لیے ادبی، علمی، تفریحی اور دستاویزی پروگرام بھی پیش کیے جسے (جنھیں) عام طور پر پسند کیا گیا۔ البتہ اس میدان میں وہ مہارت کے اس مقام پر نہیں پہنچ

سکے، جسے ہم کامیابی سے موسوم کرتے ہیں۔'' (ص:246)
اس اقتباس کا آخری ایک انحرافی جملہ اُن کے مجموعی تبصرے کے مزاج سے میل نہیں کھاتا بلکہ اُن کے ذہن کی کسی کھٹکن کی طرف اشارہ کرتا ہے، جس کا وہ اظہار نہیں کر سکے۔

بہتر ہوگا کہ یہاں 'سردار جعفری کی سنیما اور دوسرے ذرائع ابلاغ کے ذریعے انجام دی گئی' قوم کی ناقابلِ فراموش خدمات' کی حقیقت بیان کر دی جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ اُن کے گنتی کے چند فلموں کے لیے لکھے ہوئے گیتوں کو تو گوارا یا خوب کہا جا سکتا ہے لیکن اُن کے فلم اور ٹی وی کے اسکرپٹ عموماً کمزور، غیر دل چسپ اور بے اثر ہوا کرتے تھے۔ اُنھوں نے خواجہ احمد عباس کے اشتراک سے ایک ہی فیچر فلم 'گیارہ ہزار لڑکیاں'، بنائی تھی، جو اپنی کہانی، اسکرین پلے، ڈائریکشن اور پروڈکشن غرض کہ ہر اعتبار سے ایک انتہائی بے جان اور فلاپ فلم ثابت ہوئی تھی۔ بابوراؤ پٹیل نے اپنے جریدے 'مدر انڈیا' میں اسے ایک 'dull, boring and propaganda picture' قرار دیا تھا۔ یوں تو خود خواجہ احمد عباس ہی اپنی ہر فلم کو اپنی سیاسی نعرے بازی کی بھینٹ چڑھانے کے لیے کیا کم تھے، پھر یہاں تو معاملہ یک نہ شُد دو شُد کا ہو گیا تھا۔
اس فلم کے بعد سردار نے پھر کبھی اپنے خشک، بے لطف اور سیاست سے ملوث نظریات کو بڑے یا چھوٹے پردے پر پیش کرنے کے لیے اپنے کھیسے (کیسہ کا مہنّد) کا سرمایہ برباد نہیں کیا تھا بلکہ اس کے لیے حکومت کے coffer سے کام لینا سیکھ لیا تھا۔ خوبیِ قسمت سے اُنھیں ہمیشہ اربابِ اقتدار کی قربت حاصل رہی تھی۔ بلیک اینڈ وائٹ دور درشن کے اکلوتے چینل کے دور میں اردو پروگراموں کا سیاہ وسفید برسوں تک سردار ہی کے ہاتھوں میں رہا تھا۔ جس کے 'آئینہ خانہ' میں کیمرا زیادہ تر اُن ہی کی ذاتِ گرامی پر مرکوز رہتا تھا اور دیگر شرکا کو اپنی بات کہنے کا بہت کم موقع ملتا تھا۔ 'محفلِ یاراں' میں غالب، اقبال، سیماب کی برسی، شاعر و کلام شاعر، ترقی پسندی بمقابلہ جدیدیت جیسے پروگراموں سے ہٹ کر کوئی پروگرام پیش ہوتا تھا تو وہ گجراتی میں غزل، مراٹھی میں غزل، پنجابی میں غزل، اُڑیا میں غزل یا کسی پڑوسی ملک کے مہمان ادیب کے انٹرویو پر مبنی ہوا کرتا تھا اور ایسے پروگراموں کے ذریعے سردار کی کوشش دیگر زبانوں اور پڑوسی ممالک میں اپنی ساکھ بنانے کی رہا کرتی تھی۔
'کہکشاں' کے ذریعے سردار نے جوش، جگر، فراق، حسرت، مخدوم اور مجاز جیسے مشہور شعرا کے حالاتِ زندگی کو مجموعی طور پر کوئی سترہ ایپی سوڈ میں پیش کیا تھا۔ ان میں صرف فراق پر پیش کیے گئے پروگرام کو کافی حد تک کامیاب کہا جا سکتا ہے، جس کی اسکرپٹ میں کیفی اعظمی صلاح کار تھے۔ حسرت موہانی پر سردار کی لکھی ہوئی اسکرپٹ محض اُن کے حالاتِ قید و بند اور چکّی کی مشقت کے گرد گھومتی رہ گئی تھی جو کہ اُن کی زندگی کے صرف دو برس کا ماجرا ہے اور وہ بے حوالہ اسکرپٹ بھی تمام تر حسرت کے ایک زمانے میں تحریر کردہ 'مشاہداتِ زنداں' پر مبنی تھی۔ مجازؔ و جگرؔ کے سلسلے میں اُن کی شراب و شباب سے شیفتگی کے پہلو کو جتنے پُرکشش طریقے سے اُبھارا گیا تھا، اُن کی حیات کی حسرت و عبرت کی تصویر اتنے نمایاں ڈھنگ سے نہیں پیش کی گئی تھی۔ جہاں علی گڑھ یونی ورسٹی کی طالبات کا مجاز کی شاعری پر فدا ہو کر 'آہنگ' کے اشعار گنگنانے اور ایک معزز خاندان کی بیاہتا خاتون کے مجاز کے عشق میں مبتلا ہونے کا قصہ قصداً تفصیل سے کئی ایپی سوڈ میں دکھایا گیا تھا، وہاں کم از کم یہ بھی بتا دیا جانا چاہیے تھا کہ جب مجاز اپنی کثرتِ مے نوشی کے سبب بدنام ہو گئے تھے تو اُن کا رشتہ قبول کرنے کے لیے کوئی گھر تیار نہ تھا اور وہ ایک بار بَر ڈھونڈنے کے لیے اجمیر گئے تھے تو بیرنگ لوٹا دیے گئے تھے۔ بے روزگاری اور شراب نوشی کے ہاتھوں دق کے مریض ہو کر جب وہ آٹھ نو ماہ تک اسپتال میں پڑے رہے تھے تو اُن کی امداد کے لیے جریدہ 'شاہراہ' کے قائم کیے ہوئے 'مجاز فنڈ' میں صرف سوا سترہ روپے جمع ہو پائے تھے (بحوالہ صفیہ اختر)۔ میرے کہنے کا

مطلب یہ ہے کہ ایسے تلخ حقائق سے نظریں چُرانے یا سرسری گزر جانے اور اُن کی زندگی کے گلیمر کو ہائی لائٹ کرنے کا رویّہ بھی اردو کے نیم تعلیم یافتہ اور ناپختہ نوجوانوں کو شاعری کی نامعقول راہ پر لگانے کا ایک بڑا سبب بنا ہے۔ جگر کا سارا ایپی سوڈ بھی اصغؔر وجگؔر کے نکاح وطلاق کے دل چسپ وعجیب معاملات یا پھر جگر کی مے خواری اور طوائف بازی کے مشغلے سے بھرا ہوا تھا۔ حقیقت پسندی تو یہ ہوتی کہ اصغر وجگر کا اپنے اپنے صندوقچے اُٹھائے شہر بہ شہر، قریہ بہ قریہ عینکیں بیچ کر تحصیلِ معاش کرنا اور ایسی ہی زندگی کی دوسری وارداتوں کو بھی دکھایا جاتا، لیکن اب اسے کیا کہیے کہ سردار نے اُن شعرا کی سوانحِ حیات میں سے چھٹک کر بیچنے والا مال پیش کرنا زیادہ پسند کیا تھا۔ جوش کی زندگی کا قصّہ اُن کے پاکستان منتقل ہونے کے واقعے کے ساتھ ختم کر دیا گیا تھا، جب کہ جوش کے آخری دور کا بابِ عبرت بھی دکھایا جانا چاہیے تھا، جس پر اُن کی یہ تحریر ثبت ہے۔

میں کراچی میں ہوں اے جوشؔ کہ کوفے میں حسین
سب شہادت کے ہیں آثار چنا جور گرم

دوردرشن کے اُس دور کے اردو پروگراموں پر روزنامہ 'قومی آواز' (بمبئی) کے مبصر جوڑے 'ابنِ آدم بنتِ حوا' نے ایک بار سردار جعفری کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا:

''...ہم شروع سے کہہ رہے ہیں کہ ٹی وی پر اردو زبان کے نام پر ہمیشہ بے وقت کی راگنی گائی جاتی ہے۔ وہ خود ایمان داری سے یہ بتادیں کہ اب تک ان کے دیے گئے پروگراموں میں کوئی ایک بھی صحیح معنوں میں قومی، سماجی، مذہبی یا سیاسی اعتبار سے صحت مند پروگرام کہا جاسکتا ہے! مردہ پرستی اور راگ رنگ کے علاوہ اردو کے پروگراموں نے عوام کو کچھ دیا ہے!'' (فروری 1982ء)

اقبال کے صد سالہ یومِ پیدائش پر فلمز ڈِویژن کی پیش کی گئی ڈاکومنٹری میں سردار نے شاعرِ مشرق کے بارے میں اپنے عہدِ گذشتہ کی اُن رایوں کا کفّارہ ادا کرنے کی کوشش کی تھی، جن میں اُنھوں نے اقبال کے یہاں نظریاتی تضاد کو دیکھ کر لکھا تھا کہ اُن کی شاعری کے زندگی بخش عناصر میں زہریلے عناصر پیوست ہیں اور یہ کہ وہ شاعر بڑے ہیں پر فلسفی چھوٹے (بحوالہ 'ترقی پسند ادب')۔ اقبال ہی کی طرح منٹو اور حسن عسکری پر بھی سردار کے عہدِ شباب کے ایسے ہی منفی بیانات کی جم کر مخالفت کی گئی تھی لیکن بہر کیف ان رایوں کے بے ساختہ، بے لوث اور فطری ہونے میں تو کوئی کلام نہیں ہوسکتا۔ اقبال کی ڈاکومنٹری کے زمانے تک پُل کے نیچے سے کافی پانی بہہ چکا تھا اور سردار کا شباب، شیب میں ڈھل چکا تھا، اس لیے یہاں سردار نے اپنی کامنٹری میں اقبال کے بارے میں مصلحت و سیاست اور نقادوں کی اکثریتی رائے کی متابعت میں سپر اندازی کا اپنا وہ رویّہ جاری رکھا، جس کا ڈول وہ کچھ عرصے پہلے 'اقبال شناسی' میں ڈال چکے تھے۔ یہاں پر مجھے یگانہ کا وہ مصرعہ سردار پر زیادہ چسپاں نظر آرہا ہے جو دراصل اقبال کے 'سر' کا خطاب قبول کرلینے پر کہا گیا تھا: ع حیف شاہین رایتا کھانے لگا!

دراصل ہمارے ہندستانی دانش ور ہمیشہ اقبال کو اس ڈھنگ سے پیش کرنے میں کوشاں رہے کہ باغباں بھی خوش رہے، راضی رہے صیّاد بھی۔ جو حکومتِ ہند کی قبولیت اور مسلمانانِ ہند کی عقیدت دونوں کی میزان پر پورا اُترے اور اقبال کے نام پر صدی، سیمی نار، شناسی، یوم اور جشن کا بازار بھی گرم ہوتا رہے۔ اقبال کی صد سالہ تقریبات ہی کے موقع پر جسٹس جاوید اقبال ہندستان آئے تھے تو انھوں نے پاکستان جاکر اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ اقبال تو صحیح معنوں میں نظریۂ پاکستان کے بانی اور ایک اسلامی مفکر تھے۔ ہند کے اسکالر اُن میں جس طرح کی ہندستانیت ڈھونڈ رہے ہیں اور اُنھیں سیکولرسٹ اور سوشلسٹ ثابت کررہے ہیں اسے دیکھ کر وہ حیران ہیں' (بحوالہ شمس کنول، اڈیٹر 'گگن')۔

زیادہ کیا لکھوں اے پیارے لوگو! جب ایک روپے میں اسٹار

پاکٹ بُکس کا 'دیوانِ غالب' ملا کرتا تھا تو سردار پینتیس چالیس روپیوں والے غالب و میر کے دواوین بنگلوں کے مکینوں کے لیے شائع کرنے اور روشن لال وڈیرا کے سرمایے سے ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو کلووزنی 'گفتگو' جاری رکھنے میں مشغول رہا کرتے تھے۔ کسی زمانے میں کھیت واڑی اور اندھیری کے کمیون میں زندگی گزارنے والے سردار جعفری کے لیے اب اپنے 'سیتا محل' کے عیش کدے سے بذریعۂ کار بمبئی کے شان دار 'Gaylord Hotel' کے آراستہ کانفرنس ہال تک پہنچنے کا تکلف، یہ اعلان کرنے کے لیے ضروری ہوگیا تھا کہ لوگ 'یومِ کبیر' منایا کریں اور اُن کی نئی کتاب 'کبیر بانی' کا مطالعہ ضرور کریں۔ اگر ہم اُس دور کے ایسے حقائق کا منظرنامہ اپنی نظروں کے سامنے رکھیں تو اس سوال کا جواب پانا مشکل نہیں رہ جاتا کہ جب ترقی پسندوں کے دن پھرے تو ترقی پسندی کے دن کس طرح پورے ہوگئے۔

اپنے ایک اداریے 'حسن کی تاثیر' میں اُنھوں نے مشہورِ زمانہ مقولے 'ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔' سے آغاز کرتے ہوئے بیگم عطیہ فیضی سے اقبال اور شبلی کے تعلقِ خاطر کا ذکر چھیڑا ہے اور لکھا ہے کہ 'اقبال، شبلی اور عطیہ، ایک خوب صورت مثلت۔ ایک ایسا مثلث جو مشہور بھی ہوا اور بدنام بھی' (ص: 46)۔ عطیہ کے ساتھ لگا ہوا 'خوب صورت مثلث' کا ٹکڑا شاید ثقہ حضرات کی جبینوں کو پُرشکن کردے گا، یوں بھی مثلث کی تکرار ضروری نہیں تھی۔

اس بات کا خیال بھی محال ہے کہ اقبال و شبلی کی کامیابی میں عطیہ کا کوئی رول رہا ہوگا۔ اتنا ضرور ہے کہ ان مشاہیر نے اپنی زندگی کے چند ماہ و سال میں عطیہ کی صحبتوں سے یا پھر اپنی شعر و شاعری اور مکتوبات میں اُن کو مخاطب کرکے اپنے رومانی ذوق کی تسکین کرلی تھی۔ مدیر نے بجا فرمایا کہ 'اقبال کو تو یورپ کے قیام کے دوران ایسے مواقع زیادہ میسر آئے ہوں گے کہ خوب صورت اور آزاد خیال عورتوں سے قرب حاصل کرتے' (ص: 46) لیکن یہ بات قرین قیاس نہیں کہ مولانا شبلی کا بھی معاملہ کچھ ایسا ہی تھا، (ایضاً)۔ اُنھوں نے ایک دل چسپ سوال یہ اُٹھایا ہے کہ کیا اقبال اور شبلی میں کبھی رقابت کا جذبہ اُبھر کر سامنے آیا؟ جیسا کہ عام طور پر عشق میں ہوتا ہے۔' (ص: 46)۔ لیکن کہیں اُن کا یہ سوال متنازعہ نہ بن جائے، یہ سوچ کر اُنھوں نے دونوں کے جذبۂ عشق کو صادق قرار دے کر خود ہی معاملہ رفع دفع کردیا ہے، جب کہ یہ بات تو وہ بھی جانتے ہوں گے کہ یورپ میں اقبال سے ہوئی چند ملاقاتوں کے بعد عطیہ ہندستان لوٹی تھیں تو پھر شبلی سے اُن کے تعلقات میں وہ پہلا سا طرزِ تپاک نہیں رہا تھا۔ بہرکیف اقبال اور شبلی میں رقابت کا جذبہ اِس بِنا پر خارج از امکان ہے کہ اوّل تو اقبال کی حیات میں، بلکہ اُن کی رحلت کے نو سال بعد تک عطیہ کے لیے اقبال کے دلی جذبات کا کسی کو علم نہ ہوسکا تھا۔ وہ تو 1947ء میں جب عطیہ فیضی نے اُن کے نام آئے اقبال کے خطوط شائع کیے تو لوگوں کو پتا چلا تھا۔ دوسرے یہ کہ یہ تینوں کبھی ایک زمانے میں ایک مقام پر یکجا بھی نہیں ہوئے تھے کہ رقابت کی نوبت آتی۔ (یہ اور بات ہے کہ اقبال اور شبلی الگ الگ موقعوں پر عطیہ اور پنے اصل رقیبِ روسیاہ رحمین فیضی کے ساتھ ضرور یکجا ہوئے تھے۔ اسیم) شبلی نے اقبال سے کئی برس قبل بمبئی کے 'ایوانِ رفعت' کی محفلوں یا 'کنارِ آبِ چوپاٹی اور گلگشتِ اپالو' کے حسین لمحات میں اپنا دل کھویا تھا اور اقبال نے یورپ میں 1907ء میں عطیہ سے پینگیں بڑھائی تھیں۔

ابرار صاحب رقم طراز ہیں:

''عطیہ فیضی اعلا تعلیم یافتہ، مہذّب اور باذوق خاتون تھیں اور اُنھیں کم از کم تین زبانوں: اردو، فارسی اور انگریزی پر عبور حاصل تھا۔ ساتھ ہی وہ فرانسیسی بھی جانتی تھیں' (ص: 47)۔''

یہاں پر مجھے اردو اور فارسی پر عبور کی بات قبول کرنے میں تامل ہے۔ خود شبلی نے اپنے خطوط میں عطیہ کو اردو زبان و محاورے کی غلطی

پر متنبہ کیا ہے۔ شاید وہ عطیہ کی فارسی کی استعداد سے بھی پوری طرح مطمئن نہیں تھے۔ ایک خط میں لکھا تھا کہ 'ولایت سے آجاؤ اور موقع دو تو تم کو فارسی کا پورا اُستاد بنا دوں گا۔'' (آگے کی عبارت ہے: ''گو خود شاگردی کے بھی قابل نہیں۔'' اتنے بڑے عالم کی اپنے سے بیس سال کم سِن عطیہ کے حضورِ حسن میں یہ نیاز مندی کیا کچھ نہیں کہتی! اسیم) خیر، حیرت کی بات یہ ہے کہ ابرار صاحب ہمیں عطیہ کے ذوق وشوق اور کمال وہُنر کی اصل جولان گاہ کی کوئی خبر نہیں دیتے۔ عطیہ انگلستان میں قدیم و جدید فلسفے اور ادبیات کی تعلیم حاصل کرنے گئی تھیں اور وہ اپنی زندگی میں جن فنونِ لطیفہ کی دلدادہ رہیں، وہ تھے: رقص، موسیقی اور مصوری۔ ان عناصر سہ گانہ کو لے کر اُنھوں نے بمبئی میں اعلا طبقے کی ہم ذوق خواتین کے ساتھ 'تھری آرٹ سرکل' بھی قائم کیا تھا۔ لندن میں اپنے شوہر رحمین فیضی کے لکھے ہوئے ڈراموں کو اسٹیج کرنا اور ہندستانی موسیقی پر امریکا او ریورپ میں لکچرس دینا بھی اُن کا دل پسند مشغلہ رہا تھا اور اُنھوں نے رحمین فیضی کے مصوری کے بیش بہا کلیکشن کو اپنے آخری وقت اور مفلسی کے دنوں میں بھی بچائے رکھنے کی پوری کوشش کی تھی۔ اُن کا نتیجۂ تحریر بھی زیادہ تر موسیقی کے موضوع پر ہے اور انگریزی زبان میں سامنے آیا ہے۔ شبلی بھی عطیہ کے ذوقِ موسیقی کے لیے جو حسنِ ظن رکھتے تھے، لگتا ہے وہ عطیہ کی دوسری لیاقتوں سے زیادہ لبھاؤ نا تھا۔ اُنھوں نے ایک بار عطیہ کو لکھا تھا: 'ان باتوں کے ساتھ اگر تم موسیقی سے بھی واقف ہو تو تم اجازت دو کہ لوگ تم کو پوجیں۔ وَ اَنَا اَوّلُ العَابِدِ ین۔' [(ترجمہ: اور جو پوجنے والے ہیں، مَیں اُن میں سب سے اوّل ہوں۔) بحوالہ 'خطوطِ شبلی' مرتّبہ محمد امین زبیری]

ہمارے بزرگ ادیبوں کی یہ بڑی ستم ظریفی ہے کہ وہ 'عشق توفیق ہے گناہ نہیں' کے حیلے سے خود تو اقبال شبلی اور عطیہ کے عشقیہ تعلقات کا تذکرہ مزے لے لے کر کر جاتے ہیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ اقبال اور شبلی کی عظمت کی محافظت کے خیال سے اس ضمن میں وہ اکرام وزبیری وقریشی جیسے سابقون الاولون راویوں کی شوخیِ اسلوب پر تبرّا بھیجنا بھی نہیں بھولتے۔ 'آج کل' کے مدیرِ محترم نے بھی یہ روایتی فرض اِن لفظوں میں ادا کیا ہے:

''اِن شخصیات کو داغ دار کرنے کی مذموم کوشش ضرور کی گئی اور اس کے پیچھے لوگوں کی جو ذہنیت اور جو نفسیات کارفرما تھی، اسے اقبال نے ایک شعر میں بڑی خوب صورتی سے بیان کر دیا ہے۔

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بے چاروں کے اعصاب پر عورت ہے سوار''

اب چونکہ اقبال خود بھی شاعر تھے، اس لیے اُن کے اعصاب بھی محفوظ نہ تھے۔ ایک محبوبہ کے علاوہ تین بیویوں سے چار شادیوں (بحوالہ خالد سہیل، مشمولہ 'ادیبوں کی حیاتِ معاشقہ') پر بھی بس کہاں تھا۔ مہاراجا سر کشن پرساد کو علامہ نے اپنے ایک خط میں لکھا تھا: ''ایک معصومہ پنجاب میں رہتی ہے۔ میں نے کبھی اسے دیکھا نہیں، مگر سُنا جاتا ہے کہ حُسن میں لاجواب ہے... خط موصول ہوا ہے کہ مجھ سے نکاح کر لو... دل تو یہی چاہتا ہے کہ اس کارِ خیر میں حصّہ لوں مگر کمر میں وہ طاقت نہیں رہی۔' یعنی علامہ کے لیے 'حسن لاجواب کا چرچا' ہی اپنے کمر کے دم خم کا جائزہ لینے کا بہانہ بن گیا تھا۔ اس عورت کی سیرت کا جاننا ضروری سمجھا گیا، نہ ہی اُس کی فلاح اور کارِ خیر کی کوئی اور صورت سوچی گئی۔

ابرار صاحب نے اپنا ہر اداریہ اپنے وقت کے لحاظ سے 'آج کل' کے متعلقہ شمارے کے خصوصی موضوع و مندرجات کو دھیان میں رکھ کر لکھا تھا، اِس لیے لامحالہ اُن مشمولات کی تفصیل پر بھی قلم فرسائی کی گئی تھی، اب جب کہ اُس مواد تک آج کے قاری کی رسائی نہیں ہے، اُس کے لیے کتاب کا تقریباً ایک چوتھائی حصّہ غیر اہم ہو کر رہ گیا ہے۔ اِس کے علاوہ اِن اداریوں میں باوجود کمالِ

احتیاط کے کہیں کہیں سہو وخطا کے نشان رہ گئے ہیں۔طوالت کے خوف سے صرف ایک اداریے (بابتہ نومبر 2002) پر نظر کروں گا۔صفحہ 25 پر لکھا ہے: ''راکیش شرما نے جب چاند سے 'سارے جہاں سے اچھا ہندستاں ہمارا' کہا تھا''۔دراصل راکیش شرما پہلا ہندستانی تھا جس نے خلائی سفر کیا تھا، نہ کہ وہ چاند پر گیا تھا۔اگلے صفحے پر ایک اور عجیب بات درج ہے: ''غبارِ خاطر مولانا کے سیاسی افکار کا آئینہ بھی ہے اور ادبی شاہکار بھی۔'' مزے کی بات یہ ہے کہ مولانا آزاد کے اس صحیفہء زنداں میں ان کی تمہیدِ گرفتاری کے سوا اس کتاب کا سیاست سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔مولانا نے اس ادبی شاہکار میں اپنے عہدِ طفلی، ابتدائی تعلیم، اپنے مزاج ومشاغل اور اہلیہ کی علالت ورحلت کا ذکر کیا ہے یا پھر مذہب، فلسفہ، سائینس ،اسرارِ ہستی ونیستی اور فلسفہء انانیت پر اپنے افکارِ گراں مایہ پیش کیے ہیں یا پھر اپنے ذوقِ موسیقی، شوقِ باغبانی اور حکایتِ زاغ وبلبل سے خوانِ ادب کو سجایا ہے، اگر گریز کیا ہے تو خارزارِ سیاست سے۔

گرچہ 'آج کل' ایک ادبی رسالہ ہے پر اس کے موضوعات میں خاصا تنوع رہا ہے، جس کا پرتو ان اداریوں میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔مدیر کا قلم کسی اداریے میں خلائی شٹل کی تباہی میں جان گنوانے والی کلپنا چاولا کے غم میں سوگوار ہے تو کسی اداریے میں ہری ونش رائے بچّن کی مدھوشالا کی مے سے سرشار۔کہیں ریشمی رومال تحریک کے جان ہاروں کو یاد کیا گیا ہے تو کہیں ہندستانی سنیما کی صد سالہ الھڑ حسینہ کو۔ ایک اداریے میں آزاد ہند میں بڑھتی مذہبی عدم رواداری، کرپشن اور بدعنوانی پر فکرمندی جتائی گئی ہے تو ایک میں جمہوریت کی ساٹھویں سال گرہ پر جمہوری اقدار کے تحفّظ اور پاس داری کی اہمیت بتائی گئی ہے۔ایک اداریے میں مذہبی جنون اور فسادات کے پُرفتن دور میں جیو اور جینے دو کے پیام رساں صوفی ازم کو موضوع بنایا گیا ہے، ایک میں مرسی کلنگ کو تو، یومِ خواتین کے تعلق سے لکھے گئے ایک اداریے کے ضمن میں کیا ہی پُر اثر شعر آویزاں کیا گیا ہے:

لڑکیوں کے دُکھ عجب ہوتے ہیں، سُکھ اس سے عجیب
ہنس رہی ہیں، اور کاجل بھیگتا ہے ساتھ ساتھ

مجموعی طور پر 'اداریہ نویسی اور میرے اداریے' ایک اہم کتاب ہے اور یہ اداریے ایک تجربہ کار مدیر نے بڑی جی داری اور جگر کاوی سے لکھے ہیں۔اچھا ہوا کہ اب یہ کتابی صورت میں محفوظ ہو گئے ہیں۔اپنے زمانے اور ضرورت کے لحاظ سے گوناگوں موضوعات پر لکھے گئے ان اداریوں میں بہت سے کام کے مطالب بکھرے ہوئے ہیں اور ان کا مطالعہ آج کے دور کے مطالبات بھی پورے کرتا نظر آتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری ادبی دنیا کے انداز واطوار میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئی ہے۔

شرح

دیوانِ غالب

شارح

سید محمد ضامن کنتوری

مرتبہ

اشرف رفیع

قیمت: -/1200 روپے

-/800 طلباء ایڈیشن

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

www.ephbooks.com

مضمون

بلراج بخشی

نارنگ شناسی: 'ادبی تھیوری، شعریات اور گوپی چند نارنگ

روئے زمین پر انسان ہی ایک ایسا جانور ہے جس میں نہ صرف قوت گویائی کی صلاحیت ودیعت ہے بلکہ وہ اپنے ماحول کے معروضی اور استخراجی مشاہدے سے نتائج اخذ کر کے تعمیم جوئی بھی کر سکتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ وہ ان مشاہدات کو اپنے ہمعصروں میں ترسیل کرتا ہے بلکہ آئندہ نسلوں تک بھی منتقل کر کے، انہیں انسانی حافظے میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیتا ہے۔ یہ جبلت کسی اور جانور میں نہیں ہے۔

انسان اپنے مشاہدات کے مطابق اپنے ردعمل، اپنی عادات اور اپنا طرز حیات وضع کرتے ہیں۔ اقدار کی انہیں مجموعی اکائیوں، جنہیں غیر شعوری طور پر آئندہ نسل کو منتقل کیا جاتا ہے، کو ثقافت کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ہر خطے میں منفرد ثقافتی اقدار کی نشو و نما ہوتی ہے جو باہم متخالف بھی ہو سکتی ہیں کیوں کہ ثقافتی تحفظات و ترجیحات اکتسابی اور وراثتی تو ہوتی ہیں مگر خلقی یا توارثی نہیں۔ لہٰذا ثقافت کے اکتسابی مرحلے سے گذرنا ہر انسان کے لیے ناگزیر ہے کیونکہ تہذیب و ثقافت کوئی ہنگامی طور پر ترتیب دیا گیا سبق نہیں ہے جسے کسی طبقے کو پڑھایا یا سکھایا جا سکے۔ تہذیب و ثقافت کو لاشعوری طور پر جیا جاتا ہے اور یہی اس کی بقا کی ضامن ہے۔

کسی بھی تہذیبی ماحول میں اخذ کی گئیں جبلتوں اور اقدار کے مطابق ہی زندگی بسر کی جاتی ہے اور اس مخصوص معاشرے کے اعتقادات، معیار، اور اطوار کے حاسدانہ تحفظ کے لیے لوگ جان لے بھی لیتے ہیں اور جان دے بھی دیتے ہیں۔ یہ صورتحال صرف نوع انسانی ہی میں دیکھی جا سکتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انسان ایک Social animal ہے۔ لیکن صرف انسان ہی کیوں، ہر جانور اپنے معاشرتی ماحول میں ایک Social animal ہے۔ خفیف ترین یک خلوی جاندار اور یہاں تک کہ خوردبینی جرثومے بھی اپنی نوع کے معاشرے ہی میں پنپ سکتے ہیں لیکن صرف حیاتیاتی سطحوں پر، انسان کی طرح تہذیبی اور ثقافتی سطح پر نہیں۔ کتا، گائے، گھوڑا، اور کئی دوسرے جانور ہزاروں برسوں سے انسان کے ساتھ ہی رہ رہے ہیں اور ان کی domestication اس حد تک ہو چکی ہے کہ اب وہ انسانی معاشروں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ لیکن ہزاروں سالوں سے انسان کی قربت میں رہ کر بھی یہ جانور انسان کی استعداد گویائی سے اکتساب نہیں کر سکے۔

انسان کے قریبی رشتہ دار چمپانزیوں کا blood type اور DNA 98.6 فیصد ہمارے جیسا ہی ہے۔ جینیاتی سطح پر بھی وہ انسان سے مماثل ہیں لیکن اختراع کی ابتدائی جبلت رکھتے ہوئے بھی وہ ارتقا کے زینے پر آگے نہ چڑھ سکے۔ چنانچہ اسارتی تجربات کے دوران KOEHLER نے دو چمپانزیوں کو ایک کھمبے کے گرد ایک پیر زمین پر مار کر چلتے ہوئے دیکھا۔ ان کی تقلید میں کچھ اور چمپانزی بھی ویسا ہی کرنے لگے۔ ان کے اس مجموعی طرز عمل پر کسی ایسے ابتدائی رقص کا شائبہ ہونے لگا جس میں نظم یا ترتیب مفقود تھی۔ لیکن اس وقت کے بعد انہوں نے پھر کبھی اس طرز عمل کو نہیں دہرایا۔ KOEHLER نے نتیجہ نکالا کہ یہ ایک لمحاتی معاشراتی عمل تو تھا لیکن ثقافتی نہیں کیونکہ ان میں سے کوئی بھی اس عمل کو حافظے میں محفوظ نہیں رکھ سکا اور نہ ہی اپنے ہمعصروں یا اگلی نسل کو شعوری طور پر ترسیل کر سکا۔[1]

ہزاروں سال قبل کے حجری دور میں جب انسان آگ کا استعمال اور کوزہ گری کا ہنر سیکھ رہا تھا، سردیوں میں جان لیوا ٹھنڈ سے بچنے کے لیے درختوں کی چھال اور جانوروں کی کھال سے تجربے کر رہا تھا، حیرت کی بات ہے کہ اس دور میں بھی وہ رنگوں سے غاروں کی دیواروں پر جانوروں کے شکار کے مناظر بنا کر، مٹی کے ظروف پر نقش ونگاری کر کے اور عورتوں کے سینوں اور کولہوں کے ابھاروں کے مجسمے تراش کر اظہار کی جبلت کو واشگاف کر رہا تھا۔

لہٰذا زمین کے ہر خطے میں انسان سے مصوری، سنگتراشی، رقص، موسیقی اور شعروادب جیسے پیرائے وضع ہوئے ہیں اور یہ سبھی اصناف فن انسان کی داخلی جبلت، اظہار، کے غماز ہیں۔

اظہار کی ایک صنف 'لٹریچر' دراصل لاطینی لفظ LITTERA سے ماخوذ ہے۔ اسی طرح یونانی زبان کے لفظ POESIS کے معنی ہیں ' بنانا ' اور اسی لفظ سے POETRY، POESY اور POETICS کی اصطلاحیں ماخوذ ہیں۔ اسی طرح عربی میں شعر کا مطلب ہے کسی بات کو جاننا اور اسے نظم میں لانا۔ قدیم سنسکرت میں ادب کو کاوَیہ (dkO;) کہا گیا ہے جس کی دو شاخیں ہیں: (1) دَرشیَ (n`';) یعنی بصری جسے دیکھا جا سکے جیسے ناٹک، اور (2) شرَویَ (JO;) یعنی سمعی جسے سنا جا سکے۔

غاروں میں رہنے والے انسان نے اپنے باطن کے اظہار کے لیے موضوعات ومضامین کی فہرست سازی نہیں کی۔ قدیم فارسی اور عربی شعریات میں عشقیہ مضامین باندھے جاتے تھے۔ سنسکرت میں کہا گیا ہے:

''واکیم رَساتمکم کاویَم'' (okD;a jlkrede~ dkO;a)

یعنی رس سے بھرے جملے کو شاعری کہتے ہیں۔ اور 'رس' کو اس آنند یا سکون سے عبارت کیا گیا ہے جو لاشعوری اور بے ارادہ انبساط وسرشاری سے عبارت ہے اور اسی لئے کہا گیا ہے کہ شعر کی غرض وغایت عالمانہ یا حکیمانہ مسائل کا بیان یا فلسفیانہ، معاشراتی اور عصری سیاسی مسائل کے حل کی تلاش نہیں بلکہ حظ یا رس کی کشید ہے۔

مقامی فکر کے تتبع میں حالی کی قائم کردہ ادبی تنقیحات کے بعد ترقی پسندی کی جڑوں کو بین الاقوامی اقتصادی منظرنامے میں بہ آسانی تلاش کیا جا سکتا ہے جو شاید ناداروں کے معاشی سروکاروں کے تحفظ کے لیے آئیڈیولوجی کی ضابطہ بندیوں میں محصور ایک سادہ لوحانہ نجات کوش نظریے اور دوسرے کئی فنی سمجھوتوں کے باوجود محض اس لیے کسی حد تک قابلِ قبول تھا کہ اس نظریے کے داعی صمیم قلب سے انسانیت کی فلاح چاہتے تھے۔ مگر ترقی پسندوں کے حد سے زیادہ نظریاتی جبر کے خلاف ن م راشد اور میراجی کے مثبت احتجاج کو جدیدیوں نے ہائی جیک کر لیا اور باقی کے چھٹ بھئیے ان کے ساتھ محض اس لیے ہو رہے کہ ان کے پاس کسی قسم کا نظریہ تو کیا، ترقی پسندوں جیسی فنی چابکدستی بھی نہیں تھی کہ وہ کسی بھی شعبۂ اظہار میں اپنی شناخت بنا سکتے لہٰذا جدیدیت کی لایعنیت کے سوا ان کے پاس کوئی جائے پناہ نہیں تھی جہاں وہ خود کو شاعر اور ادیب کے منصب پر فائز کروا سکتے۔

یہ سمجھنا انتہائی ضروری ہے کہ مغرب میں جدیدیت کی تحریک 1890 میں شروع ہو کر 1930 میں ختم بھی ہو گئی لیکن جدیدیوں نے اس مردہ شریعت کو 1960 میں بازیافت کیا اور عدم تحفظ، ہجرت کے المیہ، تنہائی کا خوف، بے چہرگی، بیزاری، تشکیک، یاسیت، بے ثباتی، لایعنیت وغیرہ کو موضوع ادب بنا کر جدیدیت کی قبر کے مجاور بن بیٹھے۔ دراصل انیسویں صدی کے

اواخر میں مغرب میں صنعتی انقلاب، نئے نئے سائینسی انکشافات و ایجادات اور نئے رجحانات نے سکہ بند مذہبی اور معاشرتی عقاید کو بہ آواز بلند چیلینج کیا جس کا جواب clergy کے پاس نہیں تھا لہٰذا عدم تحفظ، ہجرت کا المیہ، تنہائی کا خوف، بے چہرگی، بیزاری، تشکیک، یاسیت، بے ثباتی، لایعنیت وغیرہ ان کے مسئلے بنتے رہے اور یہ مسائل مغرب کے ادبی رجحانات میں در آئے۔ لیکن برصغیر ہندو پاکستان میں تو آج بھی نام نہاد سائینسی اور تکنیکی ترقی انیسویں صدی کے مغرب کی صنعتی، سائینسی، تکنیکی سرگرمیوں کا عشرعشیر بھی نہیں ہے۔ تو واقعتاً مغرب کے مسائل کبھی ہمارے سروکار بنے ہی نہیں اس لیے بے خوف کہا جا سکتا ہے کہ جدیدیت کے عناصر ہمارے لیے محض بوئی، بجو کا تھے۔

بابائے ادب گوپی چند نارنگ کا ادبی نظریہ مسائل کی اسی درآمد کے خلاف احتجاج اور اپنی اقدار کی بازیافت کا ہے۔ لہٰذا برصغیر ہندو پاک کی اپنی ادبی، جمالیاتی، فلسفیانہ اور فکری روایتوں کی بازیافت ازحد ضروری تھی۔ انہوں نے ہندوستانی ادبی رویوں کو کاٹ پیٹ کر مغرب کے نظریاتی سانچوں میں فٹ کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ہندوستانی ادبی فکر کی جڑوں کو ہندوستانی مٹی میں دریافت کر کے اسے عالمی ادبی نظریوں کے بالمقابل کھڑا کر دیا۔ اور یہ ارادی طور پر نہیں ہوا بلکہ زمانہ طالب علمی ہی سے ان کی بلیغ النظری نے انہیں اس راہ پر گامزن کیا اور جس سہل ممتنع سے وہ اس راستے پر بڑھتے گئے، اب ایسا لگتا ہے، کہ انہیں جانا ہی اس راستے پر تھا، جیسے ان کے لیے یہی راستہ متعین تھا۔ ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اوائل عمری ہی سے وہ ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویوں، سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ، اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب جیسے مقامی موضوعات کا انتخاب کرتے۔

ڈاکٹر مشتاق صدف کی مرتبہ 'ادبی تھیوری، شعریات اور گوپی چند نارنگ' کئی پُر مغز مقالات پر مشتمل تصنیف ہے جس میں فاضل مقالہ نگاروں نے مختلف زاویوں سے ڈاکٹر نارنگ کے شخصیاتی prism کے طیفی الوان کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور نارنگ صاحب کی فکر میں پرت در پرت معانی کے کئی جہان دریافت ہوتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن ان کی فکر کا بہاؤ کسی پرشور پہاڑی نالے کی طرح نہیں ہے جو قاری کو چٹانوں کے ساتھ ٹکرا کر لہولہان کر دیتا ہے بلکہ قاری ڈل میں شکارے پر بیٹھا غیرمحسوس طریقے سے وقت کے ساتھ رواں ہے اور بدلتے مناظر کو انہماک اور محویت کے ساتھ دیکھتا ہے، سمجھتا ہے اور ان سے محظوظ ہوتا ہوا فکری طور پر آسودہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

نارنگ صاحب نے بالکل صحیح کہا ہے کہ ادب کو ڈیفائن نہیں کیا جا سکتا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ نہ تو کسی اچھے فن پارے کے اجزائے ترکیبی کی فہرست سازی کی جا سکتی ہے اور نہ ہی موضوعات کی۔ اصل میں موضوعیت ادب کا مسئلہ نہیں ہے۔ ادب تخلیق کا عمل ہے اور تخلیق عدم موجود کو وجود دینے کا نام ہے۔ یہ بچے کی پیدائش سے بھی زیادہ پیچیدہ عمل ہے کیونکہ بچے کی پیدائش کا لائحہ عمل طے ہے لیکن فن پارے کی تخلیق کا کوئی سکہ بند فارمولا نہیں ہے اور نہ ہی فن پارہ کسی نظریے کا دست نگر ہے۔ بے شک کہ ہر دور میں زندگی کسی نہ کسی نظریے کے تابع ہوتی ہے لیکن نظریہ اگر پُر تقدس، ناقابل ترمیم اور حتمی ہے تو یہ معاشراتی جبر ہے پھر چاہے وہ نظریہ ادبی ہو یا مذہبی، سیاسی ہو یا سائینسی۔ بحث کے اس مرحلے پر ہندستانی ادب میں نظریے سے متعلق کلاسیکی رویے کا سرسری تذکرہ ضروری ہو جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک چڑی مار کے تیر نے سارسوں کے جوڑے میں سے ایک کو مار دیا۔ رشی والمیکی اس اندوہناک منظر کو دیکھ کر اس قدر غمزدہ ہوئے کہ انہوں نے چڑی مار کو بددعا دی۔

یہ بددعا ایک شعر کی صورت میں تھی جو ان سے بے ساختگی میں ادا ہو گیا:

مانِشاد پرِشٹھاتوَمہ اگماہ شاشوتی سما

یت کرونچہ متھُنادیکمہ اَودھی کام موہتمہ

ek fu'kkn Áfr'Bka Roe vxe%

'kk'orh% lek%A

;rØksapfeFkquknsde~ vo/kh% dke

eksfgre~AA

(اے شکاری تو کبھی تعظیم (سکھ) نہ پاسکے کیونکہ تو نے عشق کے

سمندر میں غوطہ زن سارسوں کے جوڑے میں سے

ایک کو ماردیا)

گہرے رنج والم کا یہ شاعرانہ اظہار قدیم رزمیوں کے اُس دور کا پہلا شعر تھا۔ اس اعتبار سے والمیکی پہلا شاعر (vkfn dfo) اور رامائن پہلی نظم یعنی آدی کاویہ ہے، ایک مسلسل المنامہ ہے جس میں ہر کردار جسمانی، اور جذباتی کرب کی انتہا کو نہایت صبر سے برداشت کرتا ہے۔ لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ رامائن میں فنِ شاعری عروج پر ہے۔ والمیکی نے فنِ کردار کشی کو تو اوجِ کمال تک پہنچایا ہی ہے اس نے شعری تلازمات کا بھی بھرپور استعمال کیا۔ والمیکی نے پہلی بار ویدی عروض اَنُشٹُھ (vuq"VHk) استعمال کیا۔ رِشی وید ویاس نے بھی مہابھارت میں زیادہ تر یہی عروض استعمال کیا ہے۔ لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ والمیکی سنسکرت شاعری کے باوا آدم ہیں۔ مرکزی خیال، کردارکشی، جذبات کی عکاسی، عروض میں تغیرات اور اسلوب و اندازِ بیاں کے لیے بعد کے کلاسیکی سنسکرت شعرا نے والمیکی ہی کو اپنا اُستاد و رہنما تسلیم کیا۔ کہا جاتا ہے کہ متاخرین کو جو بھی شعری تصورات وراثت میں ملے وہ والمیکی اور وید ویاس ہی سے مستعار ہیں۔

لیکن جین اور بُدھ تخلیق کاروں نے بعد کو مذہبی خیالات کی اشاعت کے لیے مہا کاویہ کی ہیئت اپنائی۔ دو قسم کا بدھ لٹریچر لکھا گیا: مہاوستوُ، جو بدھ کی سوانح ہے، اور للِتا وِستار جس میں بُدھ کی لیلا دکھائی گئی ہے۔ لیکن ویدی کلاسیکی سنسکرت سے لی گئی شعری روایت میں جین اور بدھ مذہبی عقاید کی اشاعت اور تشہیر کا مقصد تبلیغی اور مشنری تھا اور یہی وجہ ہے کہ اسے کوئی ادبی اہمیت نہیں دی جاتی۔ اشوگھوش اس دور کے بہترین شعرا میں سے تھا۔ 'بُدھ چرت' اور 'سَوندر یہ آنند' اس کے دو عظیم سنسکرت مہا کاویہ ہیں۔ اشوگھوش کا میلان بھی تبلیغی تھا اور اسی لیے اس کی شاعری کے کثیر حصے کو ادبی اہمیت نہیں دی جاتی۔ لیکن یہی فارمولا رامائن اور مہابھارت پر منطبق نہیں کیا جاسکتا۔ اس سلسلے میں ایک اہم نکتہ ہمیشہ خاطر نشان رہنا چاہیے کہ کم سے کم اس دور میں رامائن اور مہابھارت مذہبی صحیفے نہیں سمجھے جاتے تھے (اور آج بھی نہیں سمجھے جاتے)۔ رامائن اور مہابھارت تبلیغی صحیفے نہیں ہیں۔ رامائن اور مہابھارت میں بیان کیے گئے واقعات کا مقصد مذہبی خیالات کی تشہیر یا ابلاغ نہیں بلکہ انسانی رشتوں کی بوقلمونی کی عکاسی مقصود تھی اور آج بھی ہے۔

چنانچہ کسی بھی قسم کے نظریاتی جبر سے ماوَرائیت ہی قدیم ہندوستانی ادبی فکر کی کثیر قطبیت کی ضامن رہی ہے کیونکہ تکثیریت اور تضادات کے بِنا ایک حرکی دنیا کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے اقلیتی ادب، دلت ادب، ذات برادری کے ادب، ترقی پسندوں کا اقتصادی محرومیوں کے آوازۂ اتحاد کا ادب، اکثریتی اور اقلیتی ادب یا اقلیتی حسیت کا ادب، مزاحمتی ادب وغیرہ کے mindset سے انحراف ضروری ہے۔ لہٰذا قبیلیائی سروکاروں پر مبنی بروں خائف ادب کی حیثیت محض لحاتی صحافیانہ رپورتاژ سے زیادہ نہیں ہے۔ اور پھر جدیدیت کی علتِ بے ابلاغی یعنی لایعنیت کے

ادب کا تو ذکر ہی کیا جس میں نہ صرف قاری کے وجود ہی سے انکار کیا گیا بلکہ قاری کو حاشیے سے بھی نکال باہر کر دیا گیا، لیکن گوپی چند نارنگ نے سالم ادبی نظریۂ عالم کے پیش نظر قاری کی بازیافت اور بحالی پر اصرار کیا اور یہی نارنگ کا کارنامہ ہے۔

'ادبی تھیوری، شعریات اور گوپی چند نارنگ' دراصل نارنگ شناسی کی ایک کوشش ہے جس میں شہزاد انجم کے مقالے میں یہ انکشاف کہ نارنگ کے تنقیدی تصورات 1952 سے بدلتے رہے ہیں اور آج بھی مابہ ارتقا ہیں قطعی درست ہے کیونکہ ادب ریاضی کی کوئی equation نہیں ہے بلکہ لحظ بہ لحظ بدلتی ہوئی زندگی کی تصویر ہے۔ لسانیات کو سماجی سائنس قرار دیتے ہوئے وہ نارنگ کو لسانیاتی اور ثقافتی ناقدوں میں شمار کرتے ہیں:

> '...جب کوئی بھی تخلیق کار کسی بھی تخلیق کو وجود میں لاتا ہے تو اس کے حسن و معار کو قائم رکھنے کے لیے ایک نظریہ باطنی طور پر اس کے وجود میں رواں دواں رہتا ہے۔ جہاں تک نقادوں کا سوال ہے ہر نقاد کا ادب و فن کے حوالے سے اپنا ایک نظریہ ہوتا ہے۔ اپنے تصورات ہوتے ہیں اور اسی تنقیدی رویے سے وہ تخلیق کو جانچتا اور پرکھتا ہے..' (ص74)

شہزاد انجم نے نارنگ کے اسلوبیاتی طرز تنقید، ساختیاتی فکر اور ردتشکیل کی آسان وضاحت کر کے ان کے نظریے کو سمجھنے میں مدد کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آزادئ اظہار کا نعرہ اصل میں متھ تھا۔ جدیدیت میں غیر صحتمند رجحانات، اور مابعد جدیدیت کا اس نظریاتی جبر سے انکار اور اس کی سکہ بند ڈیفی نیشن سے گوپی چند نارنگ کا بھی انکار اصل میں نارنگ کے نظریات کی مدلل وضاحت ہے جو ان کی تفہیم میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ اس مقالے میں، فیض، شہریار، پریم چند، منٹو، کرشن چندر، انتظار حسین کے فن پر نارنگ کے مفکرانہ خیالات سے شہزاد انجم قاری کو متعارف کرواتے ہیں اور پھر نارنگ کی تصنیف 'غالب: معنی آفرینی، جدلیاتی وضع اور شعریات' کے دیباچہ سے ایک پیرا (ص93) کا حوالہ بھی دیتے ہیں جس میں نارنگ غالب کے متعلق اپنے خیالات بیان کرتے ہیں۔ اس پیرا کا حوالہ دے کر شہزاد انجم نے غالب کے بارے میں قاری کے تجسس کو انگیخت کیا ہے جس سے قاری کے دل میں اصل کتاب پڑھنے کی شدید خواہش غلبہ کر جاتی ہے۔ انجم کا مقالہ انتہائی بصیرت افروز ہے جو نارنگ شناسی میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

صفحہ 74 پر شہزاد انجم کا بیان کہ نارنگ کے تنقیدی تصورات آج بھی مابہ ارتقا ہیں بالکل صحیح ہے کیونکہ ادب ریاضیات کی ایکویشن نہیں جو دائمی ہے بلکہ ادب لمحہ بہ لمحہ بدلتی ہوئی زندگی اور اس کی ان گنت جہتوں کا لمحاتی عکس ہے جو اگلے ہی لمحے میں بدل جائے گا۔ لیکن زندگی کی اس ثباتی یا بے ثباتی کو منعکس کرنے والے ادب میں آفاقیت کا عنصر ہمیشہ موجود رہتا ہے جو اسے بڑا ادب بناتا ہے ورنہ آج اور اس لمحہ کے مسائل کو بیان کر دینا صحافت ہے، ادب نہیں۔ نارنگ کہتے ہیں:

> '...کسی ایک نظریے کی پابندی سے فکر کی تازہ کارانہ راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں ادبی لیبلوں کا سخت مخالف ہوں اور ہر پلیٹ فارم سے اپنے اختلاف اور آزادی فکر کے حق کا تحفظ کرتا ہوں۔ میرا ایمان ہے کہ کوئی سچا فنکار تنگ نظر نہیں ہوتا، ہو بھی نہیں سکتا۔ وہ سماج کا فرد ہوتے ہوئے بھی اس سماج سے بالاتر یا باہر بھی ہوتا ہے یعنی ادب کی

سب سے کھری حیثیت آؤٹ سائیڈر کی
ہے...'(ص74)

جدیدیت کے بارے میں نارنگ مزید فرماتے ہیں:

'...جدیدیت نے زندگی اور سماج پر جولعنت بھیجی تھی اور بیگانگی (alienation) تنہائی، احساسِ شکست، بے تعلقی اور لایعنیت کے جس فلسفے پر اصرار کیا تھا، وہ بڑی حد تک مغرب کی اُترن تھا اور اس کا ہمارے تہذیبی حالات سے کوئی سچا رشتہ نہیں تھا۔ یہ منفی ایجنڈا تخلیقی اعتبار سے بے اثر ہو کر زائل ہو چکا...'
(ص29)

ایک اور جگہ '...ضرورت ہے فنکاری کے تقاضوں کے ساتھ ادب کی احتجاجی اور انحرافی پر توجہ کرنے کی... (ص31)۔

نارنگ کہتے ہیں کہ اردو میں مابعد جدیدیت مغرب کی نقالی نہیں ہے۔

'...مغرب میں کلچر کا کرائسس اپنی انتہا کو پہنچ رہا ہے جو وہاں کے پوسٹ ماڈرن ازم کا حصہ ہے۔ کرائسس ہمارے یہاں بھی ہے لیکن نوعیت الگ ہے اس لیے کہ وہاں تاریخ ابھی شروع ہوئی تھی اور ابھی ختم ہو رہی ہے۔ یہاں ہزاروں برسوں کا تسلسل ہے... یہاں end of history نہیں بلکہ پراچین تاریخ میں ایک نیا ورق پلٹا جا رہا ہے۔ وہاں انسان کی تحلیل ہوتی ہوئی شناخت کا مسئلہ ہے، یہاں دو وقت کی روٹی مسئلہ ہے۔ وہاں عقیدہ فنا ہو چکا ہے، یہاں پرانے عقیدوں کے ساتھ زندہ رہنے کا مسئلہ ہے ...آزادیِ خیال اور تکثیریت کا تقاضا ہے کہ ہمارے رویے ہمارے تہذیبی اور ادبی حالات سے طے ہوں گے اور ہماری مابعد جدیدیت مگرب کے پوسٹ ماڈرن ازم سے الگ ہوگی اور اس کی اپنی الگ پہچان ہوگی۔ مثلاً جدیدیت کے عروج کے زمانے میں اردو میں ابہام، رعایتِ لفظی، مناسبتِ لفظی اور ادبی لوازم کے حوالے سے ایک خاص نوع کی میکانکیت پر زور دیا گیا، جب رویے بدلے تو اس میکانکیت کی بھی نفی کی گئی اور تکنیکی لوازم کے مقصود بالذات استعمال سے توجہ ہٹ گئی۔ دیکھا جائے تو رعایتِ لفظی یا مناسبتِ لفظی خاص ہمارے مزاج کا حصہ ہیں، ان کا اثبات و نفی خاص اردو کا مسئلہ ہے، انگریزی یا فرانسیسی کا نہیں ، اس لیے یہ خاص ہماری مابعد جدیدیت کی پہچان ہے، مغرب کے پوسٹ ماڈرن ازم سے اس کا کچھ لینا دینا نہیں... '
(ص41,42)

حقانی القاسمی نے بھی نارنگ کی نگارشات سے با قاعدہ حوالے دے کر اصرار کیا ہے کہ جس پوسٹ ماڈرن ازم کو مغربی افکار سے منسوب کیا گیا ہے اس کی جڑیں اصل میں ہندوستانی فکریات میں بہت گہرائی تک پیوست ہیں۔ حقانی القاسمی نے قاری کے تجسُس میں مزید اضافہ کیا ہے کہ سوسیور چونکہ سنسکرت پڑھتا تھا اس لیے ناممکن ہے کہ اس نے بُدھ اور ماقبل بُدھ ہندوستانی

فکریات سے استفادہ نہ کیا ہو۔لہٰذا سوسیور کے تصورات اور دریدا کے نظریۂ افتراق اور بودھی نظریہ 'شونیہ' (kwU;') بھرتری ہری کے نظریۂ 'اسپھوٹ' (LQqV) اورسوسیور کے تصورِنشان سے مطابقت رکھتا ہے۔ ظاہر ہے خالصتاً ہندوستانی فکریات سے اتنی قریبی مشابہت ومماثلت اتفاقیہ نہیں ہوسکتی۔

یہاں میں ایک بات واضح کرتا چلوں کہ 1825 تک یوروپ کی تمام اعلیٰ یونیورسٹیوں میں سنسکرت کی چیئر قائم کی جا چکی تھی۔سوسیئور کی پی ایچ ڈی کا موضوع بھی اتھر وَ وید تھا۔اور بھرتری ہری اور پانی کے مطالعے کے بعد ہی سوسیئور لسانیات کی بات کرنے لگا تھا۔

محمد ہادی رہبر نے بھی محولہ بالا بیان کی تائید میں کہا کہ نئی ادبی تھیوری کا پیشرو، سوسیئور سنسکرت کا عالم تھا اور ہندوستانی فکر سے متاثر تھا۔ ہادی دریدا کی فکر پر بھی بودھی اثرات دیکھتے ہیں ۔نارنگ فہمی کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے محمد ہادی رہبر نے متعدد گرہیں کھولی ہیں۔وہ حالی کے افادی نکتۂ نظر، ترقی پسندوں کے اقتصادی نظریۂ ادب کے مختصر جائزے کے بعد مشرقی فکریات میں مابعد جدیدیت کی جڑیں تلاش کرنے کی نارنگ کی کوششوں کی تائید کرتے ہیں۔سوسیئور کی نئی ادبی تھیوری اور دریدا کے فلسفے پر بالترتیب ہندوستانی مفکر ناگارجن کے اثرات کی بات کرتے ہوئے ہادی نے نارنگ کے ایک چشم کشا پیرا کا حوالہ دیا ہے:

> 'سوسیئور کے فلسفۂ لسان، پس ساختیات اور ردِ تشکیل کے فلسفۂ معنی کے تناظر میں یہ دیکھا جائے کہ اس بارے میں ہندستانی روایت میں کیا کیا بحثیں اٹھائی گئی ہیں اور ہندستانی ذہن کا موقف کیا رہا ہے۔ اس نظریے سے جب ہم نے ہندستانی فکری روایت اور شعریات کا جائزہ لیا تو بعض حیران کن نتائج سامنے آئے۔یعنی مغرب میں جو نکات اب ساختیاتی اور ردِ تشکیلی فکر کے ذریعہ سامنے آرہے ہیں، ان سے ملتے جلتے نکات ہندستانی فکر و فلسفے بالخصوص بودھ فلسفے میں صدیوں پہلے زیرغور رہے ہیں۔'(ص156)

نظریے کی pervasiveness پر اصرار کرتے ہوئے ہادی کہتے ہیں:

> '... دراصل کسی بھی معاشرہ میں پنپنے والا کوئی بھی ذہنی رویہ، رجحان ونظریہ کا اثر کسی دوسرے معاشرہ اور نظام پر بھی دکھائی دیتا ہے، چونکہ ہر بنیادی تصور کی اساس ادبی، ثقافتی اور معاشرتی ہوا کرتی ہے، اور وہ اسی نظام کی زائیدہ اور پروردہ بھی ہوتی ہے جس میں وہ ادب جنم لیتا ہے، حالانکہ اکتساب وہ دوسرے زبان وادب اور معاشرہ سے بھی حاصل کرسکتی ہے۔اس طرح قدیم تصورات کا عکس جدید ترین تصورات میں دیکھے جا سکتے ہیں، خواہ وہ عکس دھندلا کیوں نہ ہو۔ ہر اگلا اپنے پچھلے سے کچھ نہ کچھ اکتساب کرتا ہے۔ مابعد جدید تصور کی بہت سی باتیں سابقہ اور قدیم روایت سے ملتی جلتی ہیں مثلاً معنی، متن، مصنف، قاری اور قرأت، یہ باتیں مابعد جدید تصورات سے اگر لگا کھاتی ہیں تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔لفظ ومعنی کی بحث قدما کے یہاں خوب ملتی ہیں، خصوصاً

سنسکرت، اورعربی فارسی شعریات میں۔اردو شعریات تواس کی زائیدہ ہے۔ پھر بھرت منی، آنند وردھن اور ہیم چندر نے سنسکرت شعریات میں ابن قتیبہ، جاحظ، قدامہ ابن جعفر، جرجانی ابن رشیق اور ابن خلدون عربی شعر یات میں اور اسی طرح فارسی اور اردو شعریات میں نظامی عروضی سمرقندی، رشید الدین وطواط اور امیر غصر المالی کیکاؤس، حالی، شبلی، امداد امام اثر، شیخ محمد اکرام کے یہاں لفظ ومعنی اور اس کے متن، قرأت اور قاری اوران کے مسائل پر بحثیں ملتی ہیں۔ یہ افکار سوسیئور، رولاں بارتھ اور ژولیا کرسٹیوا کے نظریات سے مشابہت رکھتی ہیں۔ قدام ابن جعفر کا تعلق 'لفظ ومعنی' سوسیئور کے 'معنی نما' اور 'معنی' signifier اور signified کے تصور کا احساس دلاتی ہیں۔ زبان وادب سے متعلق نئ تھیوری ساختیات پس ساختیات، رد تشکیل اور نشانیات semiology تفہیمیت اور مظہریت hermeneutics, phenomenalogy اور مابعد جدید صورت حال post modern condition نئے نئے تناظر میں فلسفۂ لسان اور فلسفۂ معنی کونئ نئ جہتیں عطا کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ان کی بنیادی فکر بین المتونیت ہے، جو کہ لفظ ومعنی کی بحث سے عبارت ہے، جو فکری طور پر متن سے معنی کا رشتہ اور معنی کی بے دخلی اور اس کی معنیاتی وحدت کی شکست و ریخت کے مسائل کو بحث کا موضوع بناتی ہے، اور متن کا رشتہ براہِ راست قاری سے جوڑتی ہے۔ متن کو سمجھنے کا یہ طریقہ مابعد جدید تھیوری میں ساختیات پس ساختیات مفکرین سوسیئور (Saussure)، وولف گانگ ایزر (Wolfgong Isar)، لیوتار (Leotard)، باختن (Bakhtin)، ژولیا کرستیوا (Julia Kristeva)، میخائیل لیمپولسکی (Mikhail Lampolski)، اور ایرک روتھاسٹن (Eric Rothasten) کے نام اہم ہیں۔

مابعد جدید ڈسکورس میں متن کو سمجھنے اور متن پر قدرت حاصل کرنے کے اس قضیہ پر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اس جدید تر تھیوری کے ضمن میں قاری اساس تنقید کے حوالے سے بحث کی ہے اور اردو میں اس کا اطلاق بھی کیا ہے۔ یہ کام فقط وہی کر سکتے تھے.......' (ص165, 166)۔

ہمایوں اشرف (ص 133) نے Steiner Kvale کا حوالہ دے کر دو اہم باتیں کی ہیں:

1) کہ جو چیز جس طرح ہے اسے قبول کرنا۔ یعنی جو چیز جس طرح جس سطح پر ہے اسے اسی طرح تسلیم کرنا نہ کہ اس میں ماؤرائیت کا پہلو پیدا کرنا۔

2) سچائیاں ایک نہیں، ان کا اظہار مختلف پہلوؤں سے

ہوسکتا ہے۔

یہ دونوں averments قدیم ہندوستانی فلسفہ و فکریات سے مطابقت رکھتی ہیں اور ہندوستانی اذہان کے لیے نئی نہیں ہیں۔ نارنگ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے قدیم ہندوستانی فکر کی اس تکثیریت کو نہ صرف لاگو کیا بلکہ مغرب کے ادبی رجحانات کا ماخذ بھی اسی کو ثابت کر کے اردو میں پہلی بار قدیم ہندوستانی فکری سرمائے پر تفاخر کرنے کا موقع دیا ورنہ جدیدیوں نے تو ہماری فکری اساس کو مغرب کے ہاں گروی رکھ کر ہمیں احساس کمتری میں مبتلا کر چھوڑا تھا۔

وسیم بیگم نے نارنگ کی محققانہ تصنیفات کا نہ صرف تعارف کروایا ہے بلکہ ان کے محتویات کا مختصر مگر جامع محاکمہ کر کے قاری کے سامنے ایک menu رکھ دیا ہے کہ ان تصنیفات میں نارنگ کی ان گنت جہات میں سے کس کس سے اس کا سامنا ہوسکتا ہے۔ 'ہندستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں' یا 'سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ' یا 'امیر خسرو کا ہندوی کلام' یا 'اردو غزل اور ہندستانی ذہن وتہذیب' سے متعلق وسیم بیگم کے تعارفی جملے قاری کو متجسس کرتے ہیں۔

مشتاق صدف اپنے مقالے میں کہتے ہیں کہ صنف مرثیہ میں نارنگ نے سانحۂ کربلا کو عالمی تناظر میں نوع انسانی کے ساتھ ظلم و جبر کا استعارہ بنا دیے جانے کے عنصرات کو دریافت کیا۔ نارنگ کے نکتۂ نظر کو واضح کرنے کے لیے صدف نے جو حوالے دیے ہیں ان میں سب سے زیادہ اہم یہ ہے:

> 'مذہب کو غیر مذہبی بنانا ادب کا کمال ہے۔ مذہب کا مقام بلند سہی، لیکن ادب کی دنیا یہی بتاتی ہے کہ ادب عقیدے، فلسفے، سیاست، نظریے سب سے آگے جاتا ہے، اس لیے کہ جہاں مذہب کی اپیل فقط عقیدت مند کے لیے ہوتی ہے، شاعری کی اپیل سب کے لیے یعنی پوری انسانیت کے لیے ہوتی ہے اور انیس نے یہی کام کیا کہ اسوۂ شبیری کی حق شناسی اور دردمندی کی دولت کو اردو شاعری کی حق شناسی اور دردمندی کے آفاق میں ہمیشہ کے لیے بدل دیا۔' (ص173)

صدف نے گوپی چند نارنگ کے اس موقف کی صحیح طور پر تائید کی ہے کہ عربی پس منظر کے باوجود انیس نے ہندستانی مٹی میں سانحۂ کربلا کی اس انداز سے پیوند کاری کر دی کہ آج یہ بیشتر ہندستانی زبانوں میں ظلم وستم کا مستعمل استعارہ بن کر ہندستانی ذہن میں پیوست ہو گیا ہے۔ صدف نے نارنگ کے ایک پیراگراف کا حوالہ دیا ہے:

> ' .....ان اشعار میں واضح طور پر ہندستانی خواتین کے احساسات اور جذبات کی جھلک ہے۔ 'صندل سے مانگ بھرنا' ہندستانی رسم ہے۔ 'کھیتی ہری رہے' اور 'بچوں سے گود بھری رہے' یہ دعائیں بھی ہندستانی ہیں۔ ماتم میں 'کھلے ہیں سروں کے بال' کا رواج شاید عرب ملکوں میں بھی ہو لیکن ہندوستان میں ماتم کا تصور اس کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ 'لال' کا تصور بھی ہندستانی معاشرے سے مخصوص ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جن آرزوؤں اور تمناؤں کا اظہار کیا گیا ہے وہ بھی ہندستانی عورتوں کی ہیں' (ص177)

اردو زبان کے ہندوستانی پس منظر کے دفاع میں

نارنگ کی کوششوں کا طائرانہ جائزہ لیتے ہوئے اردو حروف تہجی کی آٹھ (فاضل) آوازوں، ذ،ض،ظ، ث، ص، ط، ح، ع کو نکال دینے کے کچھ لوگوں کے مطالبے کو رد کرتے ہوئے کوثر مظہری نے نارنگ کا موقف یوں پیش کیا ہے:

’ لیکن نارنگ صاحب اسے تسلیم نہیں کرتے۔انہوں نے اس بات پر بار بار زور دیا ہے کہ اردو کی اردوئیت جہاں اس کی مخصوص صوتیات سے قائم ہوتی ہے وہاں مخصوص لفظیات سے بھی اس کا تعین ہوتا ہے۔تلفظ میں یکساں الفاظ معانی میں فرق رکھتے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے مثالیں پیش کی ہیں کہ اگر املا کا فرق قائم نہیں رکھتے تو ہم صوت الفاظ کا فرق ہی مٹ جائے گا۔جیسے: عام اور آم،جعل اور جال ، صدا اور سدا ، عرضی اور ارضی ، صورت اور سورت ، کسرت اور کثرت ، نظیر اور نذیر، بعض اور باز ، زن اور ظن وغیرہ۔‘(ص190 ,189)

ایک بڑی بات جو نارنگ کہتے ہیں: ’ .....میں مابعد جدیدیت کی فارمولا بند تعریف کرنے کو غلط سمجھتا ہوں.....مابعد جدیدیت کی کوئی جامع و مانع تعریف ہو ہی نہیں سکتی، اس لیے کہ جو رویہ ہر طرح کے نظریوں اور ہر طرح کی درجہ بندیوں کو رد کرتا ہو، اور پہلے سے متعین کی ہوئی ہر تعریف کے جبر کے خلاف ہو، وہ خود اپنی تعریف کے جبر کو کیسے روا رکھ سکتا ہے۔ مابعد جدیدیت کی سب سے عمدہ تعریف یہ ہے کہ یہ کھلا ڈلا تخلیقی رویہ ہے جو ہر طرح کے نظریوں کے جبر سے آزاد، اردو کی نئی پیڑھی کی خواہش بھی عین یہی ہے کہ وہ کسی نظریے کا حصار کھینچنا نہیں چاہتی۔

اصل چیز تخلیق ہے۔ ...اعلیٰ فنکاری کا تقاضا بھی یہی ہے ورنہ پھر تخلیق تخلیق کا حق ادا نہیں کر سکتی۔ مابعد جدیدیت چونکہ تخلیقیت کے جشنِ جاریہ کی بات کرتی ہے، یہ نہ صرف نظریوں کے جبر کی نفی کرتی ہے، یہ خود اپنا نظریہ یا اپنا بُت بنانے کے بھی خلاف ہے ...‘

(ص43,44)

نارنگ کا یہ بیان ان ہزاروں سوالوں کا جواب ہے جو جدیدیت کے مستعملات اور متروکات کے شکار فنکاروں کا المیہ بن گئے تھے۔کوئی بھی فن نظریاتی جبر کا متحمل نہیں ہوسکتا ۔ دراصل فکر اور عقیدے میں فرق ہے۔فکر حرکی ہے،لیکن عقیدہ جامد ہے۔

عقیدے کو بدلا نہیں جا سکتا۔ نیا عقیدہ شروع تو کیا جا سکتا ہے لیکن پرانے عقیدے کو معاشراتی جبر کے بغیر بدلا نہیں جا سکتا کیونکہ عقیدہ مسلمات کی بات کرتا ہے۔ مسلمہ تھا کہ زمین ساکت ہے اور تمام سیارے اور ستارے اس کے گرد گھومتے ہیں۔ لیکن انسانیت کو یہ عقیدہ بدلنے کی بڑی قیمت چکانا پڑی تھی۔ چنانچہ نظریے اور زماں و مکاں سے ماوٗرائیت ہی ادب کے دوام کی ضامن ہے یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ دائمی ادب زماں اور مکاں سے ماوٗرا ہوتا ہے۔ میری مراد یہ نہیں ہے کہ ادب خلا میں رہتا ہے بلکہ ادب تو ہر گلی محلے میں عام آدمی کے ساتھ رہتا ہے لہٰذا دائمی ادب کے کسی بھی فن پارے کی فضا اور انسلاکات آپ کے جانے پہچانے ہوسکتے ہیں پر اس مقامیت کے باوجود اس میں ایک ایسی آفاقیت

بھی نظر آتی ہے جو ایک فن پارے کو کسی دوسرے مِلیٔو میں بھی relevantبنادیتی ہے۔

بابائے ادب گوپی چند نارنگ نے لسانیات، اسلوبیات، ساختیات اور جو کچھ بھی عالمگیر ادبی ڈسکورس اور خصوصاً ہندستانی ادبی نظریات کے حوالے سے نگارش کیا ہے انہیں ہندستانی ادبی فکر سے منسوب کیا جاسکتا ہے۔ مشتاق صدف کے یہ جملے قابلِ غور ہیں:

> 'آج ہماری تخلیقی فضا میں جو تبدیلیاں دکھائی دے رہی ہیں ان پر کسی اجنبی نظریے یا علم کا عکس نہیں، اور نہ ہی کسی طرح کی مداخلت ہی نظر آتی ہے، یہ اپنی زندگی کی ضرورتوں کا تقاضا ہیں۔ یہ اپنی تہذیبی، فکری اور ادبی ترجیحات کی پروردہ ہیں۔ مذکورہ تمام نکات پر پہلی بار اردو میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے سوچنا شروع کیا۔ انہوں نے ہی اس سمت میں غور وفکر کی نئی قندیلوں کو روشن کیا اور انہوں نے ہی نئے ادبی نشانات پر پہلی بار گفتگو کا آغاز کیا۔ یہ کہا جائے کہ ان کی نئی سوچ اور نئے فکری رویوں کی بدولت ایک معنی خیز ادبی مکالمہ کی ابتدا ہوئی تو غلط نہ ہوگا اور وہ مکالمہ' مابعد جدیدیت' کا مکالمہ تھا۔' (ص10)

گوپی چند نارنگ کی ناقدانہ صلاحیتوں اور تبحر علمی کا اعتراف کیے بِنا نہیں رہا جاسکتا کہ وہ لسانیات، مباحثہ آرائی، نظریہ سازی کے نابغہ ہیں۔

' ادبی تھیوری، شعریات اور گوپی چند نارنگ' میں فاضل مقالہ نگاروں نے نہایت عرق ریزی کے ساتھ گوپی چند نارنگ کو اس طرح ڈسکس کیا ہے کہ قاری کا تجسس بڑھ جاتا ہے اور وہ نارنگ کی فکری نہج سے مکمل طور پر آگاہ ہونا چاہتا ہے۔ بقول اصغر ندیم (پاکستان) نہیں معلوم اردو کہاں سے شروع ہوتی ہے اور نارنگ صاحب کہاں ختم ہوتے ہیں (ص56)۔ بہر حال یہ کتاب نارنگ شناسی کے لیے قاری کو انگیخت کرتی ہے۔

حواشی: (1) Anthropology by A.L.Kroeber. Page 65

OOO

این بی ٹی کے زیر اہتمام شائع انتھالوجی آج کی کہانیاں' میں نئے پرانے (52) افسانے شامل

اردو کے ممتاز نقاد اور دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ کی مرتبہ نئی کتاب' آج کی کہانیاں' نیشنل بک ٹرسٹ کے ذریعہ شائع ہو کر منظر عام پر آئی ہے جس میں 52 بہترین اردو کہانیوں کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ انتخاب آزادی کے بعد سے اب تک کے افسانوی سفر کو محیط ہے۔ یہ افسانے ساٹھ باسٹھ برس کے تخلیقی سفر کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس انتخاب میں بلراج مین را' بلونت سنگھ' جوگیندر پال' جیلانی بانو' حیات اللہ انصاری' راجندر سنگھ بیدی' رام لعل' رتن سنگھ' رشید جہاں' سرلا دیوی' سریندر پرکاش' سہیل عظیم آبادی' عصمت چغتائی' غیاث احمد گدی' قاضی عبدالستار' قرۃ العین حیدر' کرشن چندر' گلزار' نند کشور وکرم' نیر مسعود وغیرہ کی کہانیاں شامل کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں آنند لہر' بیگ احساس' ترنم ریاض' خالد جاوید' ذکیہ مشہدی' ساجد رشید' سلام بن رزاق' سید محمد اشرف' شموئل احمد' شوکت حیات' صغریٰ مہدی' طارق چھتاری' عبد الصمد' غزال ضیغم' غضنفر' ف۔س۔اعجاز' فیاض رفعت' مظہر الزماں خاں' مشرف عالم ذوقی وغیرہ کی کہانیوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

راجکماری اندرا دیوی دھن راج گیر/اشرف رفیع

آپ بیتی

یادیں

ہمارا ملک بھارت ایک ملک ہے مگر چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم ہے۔ یہ تقسیم سیاسی بھی ہے لسانی بھی۔ زبانیں ایک دوسرے کو جوڑنے کے لیے ہوتی ہیں کبھی کبھی ان میں لسانی تعصب کی وجہ سے لڑائیاں بھی ہو جاتی ہیں۔ علاقائی تقسیم کی ایک خرابی یہ ہے کہ ہم دوسرے علاقے والوں سے اپنے علاقہ کی وابستگی کی وجہ سے دور ہو جاتے ہیں۔ یہ لسانی اور علاقائی دوریاں شاعروں اور ادیبوں کے لیے بڑی رکاوٹ بن گئی ہیں۔ وہ کسی دوسرے علاقے والوں سے ملنے جلنے او رایک دوسرے کی تحریروں سے مستفید ہونے سے بڑی حد تک مجبور ہو گئے ہیں کہنے کو ہم ہندوستانی Writer ہیں لیکن کوئی تلنگانہ کا ہے کوئی بنگالی ہے، کوئی پنجابی، مراہٹی، ٹاملین، کنڑ وغیرہ زبانوں کی ان پگڈنڈیوں اور پتھریلے راستوں سے گزرنا بغیر کسی سہارے کے بڑا مشکل ہو گیا۔ اہلِ قلم کے نام سے یا زبانوں اور علاقوں کے نام سے اکیڈمیز بن گئی ہیں جن پر سیاست دانوں کا ہی قبضہ ہے۔ ان سیاست دانوں کا بھی تو ایک ٹولا ہوتا ہے ایک دربار ہوتا ہے جن سے اوسط اور اوسط سے کم درجے کے شاعر و ادیب جی حضوری کے لیے موجود رہتے ہیں۔ یا وہ ادیب یا شاعر جو سیاست دانوں کی سیڑھیوں کا سہارا لے کر اونچے سے اونچے مقامات پر پہنچ جاتے ہیں ان کے گروپس ہوتے ہیں۔ اپنے گروپ سے وابستہ لوگوں کا استحصال کرتے ہیں خود بہت کچھ حاصل کر لیتے ہیں اور اپنے وابستگان کو کچھ ٹکڑے بھی ڈال دیتے ہیں۔ اس میں اچھے اچھے قلمکار نا قدرشناسی اور ناانصافی کا شکار ہو جاتے ہیں ان کے حقوق مارے جاتے ہیں ان حالات میں ایک اچھا رائٹر اپنے مقام و مرتبہ تک پہنچے تو کیسے پہنچے۔ ششیندر کو بھی ایسے ہی مسائل کا سامنا تھا۔ میں نے سوچا کہ ششیندر کو اپنی دنیا سے نکلنے اور دوسروں تک پہنچنے کے لیے تراجم کا سہارا لینا چاہیے۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ ایک رائٹر کو اپنی ذات کے نہاں خانے سے نکلنے کے لیے اپنی زبان کے علاوہ اور دو زبانوں سے واقف ہونا چاہیے۔

1971ء سے ششیندر کی چیزوں کے تین زبانوں میں تراجم ہونے لگے وہ سامنے بیٹھ کر تلگو سے ہندی میں ترجمہ کرواتے تھے اس سے اردو میں ہو جاتا تھا اور انگریزی میں تو وہ خود لکھتے تھے جب ''میری دھرتی میرے لوگ'' ہندی میں آئی تو ہندی اسکالرز کا ردّعمل بہت اچھا رہا۔ ویسے بھی ہندی والوں میں ایک خوبی یہ ہے کہ کسی زبان کے ادب میں جب کوئی اچھی چیز آتی ہے تو بہت جلد اس کو اپنا لیتے ہیں۔ تلگو میں اس سلسلہ میں کافی مشکلات سامنے آتی ہیں یہاں تو Cast،Creed اور نہ جانے کیا کیا رکاوٹیں ہوتی ہیں۔ کسی بڑے گھنے اور چھتنا ور درخت کے نیچے کوئی چھوٹا پودا پنپ نہیں سکتا یا یوں کہیے کہ کوئی بڑا درخت اسے بڑھنے نہیں دیتا اسے اپنی پہچان کے لیے اپنی زمین تلاش کرنی پڑتی ہے اسی طرح ایک ذمہ دار رائٹر کو بھی اپنی بقا کے لیے اپنی زمینیں آپ تلاش کرنی پڑتی ہیں۔

ششیندر نے اپنے Intellectual Comrade کو وسیع تر کرنے کے لیے خط وکتابت کا سہارا لیا میں دیکھ رہی تھی کہ اس سے ششیندر کی علمی ادبی اور سماجی فضا بدل رہی تھی وہ اپنے علاقہ سے نکل کر اپنے دیش کی سرحدوں کو چھونا چاہتے تھے ایک دن راجستھان سے ان کو کوئی دعوت آئی یہ زمانہ تھا 1976ء کا ہماری شادی ہو چکی تھی جب تک ''میری دھرتی میرے لوگ'' چھپ کر شائع ہو چکی تھی اس کتاب کے ٹائٹل پر ان کی تصویر تھی۔ ٹائٹل پر

تصویر انہوں نے اس لیے دی تھی کہ اس طرح ایک تو لوگ شاعر کے کاغذی پیرہن سے واقف ہو جاتے ہیں تو دوسری طرف شاعر ٹائٹل آرٹسٹ سے بنوانے اور چھپوانے کے قابل لحاظ خرچ سے بچ جاتا ہے۔ کتاب مہنگی ہو جاتی ہے، ہم دلی سے ایک چھوٹے سے پلین کے ذریعہ جے پور پہنچے۔ ایئر پورٹ پر اترے تو دو اشخاص ان کی کتاب جس پر ان کی تصویر تھی لے کر ہمیں ڈھونڈ رہے تھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہمارے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے پوچھا ''کیا آپ ہی ششیندر ہیں''، ششیندر نے جواب دینے کے بجائے ان سے ہاتھ ملایا۔ وہ ڈاکٹر اپادھیائے تھے اور ان کے ساتھی کوئی انگریزی کے پروفیسر تھے۔ پروفیسر نے کہا آپ کی تصویر سے ہم نے آپ کو پہچانا۔ جب مجھے احساس ہوا کہ تصویریں بھی بڑی کام کی چیز ہوتی ہیں۔ جلد ہم راز باغ پیالس ہوٹل پہنچے اور سنبھل گئے۔ وقت کی کمانیں کھڑی رہتی ہیں۔ ہم تیار ہونے لگے کھڑکی سے باہر دیکھا تو خوب صورت گارڈن تھا کچھ درخت ایسے بھی تھے جن کے پتے شام ہوتے ہوتے سکڑ کر گول ہو جاتے تھے۔ ہم انبر فورٹ گئے وہاں ایک کالی کا مندر تھا یہ مندر بڑا خوب صورت تھا اس جیسا مندر ساؤتھ میں، میں نے کہیں نہیں دیکھا سنگ مرمر میں تراشیدہ ہرے رنگ بالکل اصلی لگ رہے تھے۔ وہاں بہت سے ٹورسٹ آئے ہوئے تھے جن میں فارنرز بھی تھے۔ وہ لوگ ہاتھی کی سواری کر رہے تھے اور بہت خوش نظر آ رہے تھے شاید وہ اپنے آپ کو اس عہد میں محسوس کر رہے تھے جب یہ انبر فورٹ بنا تھا۔ کیمرہ کے لینس میں گرد و پیش کے حسن کو وہ قید بھی کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک شخص جو مقامی لگ رہا تھا ہمارے پاس آیا ششیندر سے پوچھا ''آج شام آج آپ بولنے والے ہیں'' ششیندر نے تعجب سے کہا ''آپ کو کیسے معلوم؟ وہ تھے کوئی جین صاحب انہوں جواب دیا، میں کیا پورے شہر کو معلوم ہے آج ششیندر جی کا لکچر ہے''

دوسرے دن ڈاکٹر دیا شنکر جو بہت بڑے فلاسفر تھے اپنے ایک کالیگ کے ساتھ ہمیں لینے آئے۔ یونیورسٹی پہنچنے کے بعد ہمیں اپنے فیکلٹی ممبر سے ملوایا اور کہا ''آج ہمارے دوست یہاں آئے ہوئے ہیں حالاں کہ پریسیڈنٹ فخر الدین علی احمد شہر میں تشریف لائے ہوئے ہیں ان کے شہر میں کئی فنکشن بھی ہیں۔ اردو ڈیپارٹمنٹ کے پروفیسر بھی وہاں موجود تھے۔ ان سب سے ملاقاتیں رہیں سب بڑی گرمجوشی سے ملتے رہے۔ اس طرح ہماری دوستیاں بڑھتی گئیں۔ ششیندر نے یہاں Major Poets of India کے بارے میں بول رہے تھے۔ دوسرے روز ہم ڈاکٹر اندر کانت شرما کے یہاں کھانے پر مدعو تھے یہاں سی۔ نرنجن گوبنکر اور ڈاکٹر سنگھ بھی موجود تھے۔ لکچر کے دوران ششیندر جب جئے دیو کی نظم ''گیت گوبندم'' پڑھ رہے تھے تو سارا ہال بھی ان کی آواز میں آواز ملا کر گانے لگا۔ یہ سنسکرت کی بہت مشہور نظم ہے۔ اس کے بعد جودھ پور یونیورسٹی سے ششیندر کو توسیعی لکچر کے لیے دعوت نامہ آیا۔ اس لکچر کا موضوع تھا "Future Traditions of Indian Literature" لکچر ہو گیا۔ ہم واپس ہو گئے اس کے بعد کئی پوسٹ کارڈ اور خط ششیندر کو آنے لگے۔ ان میں ایک پوسٹ کارڈ تھا جس میں لکھا تھا ششیندر جی آپ کا نام اب Major Poets of India میں لیا جا رہا ہے۔ ہندی کے اہم رسائل جیسے ''دھرم یگ''، ''مدھومتی'' اور ''نیا پرتیگ'' میں آپ کی نظم میری دھرتی میرے لوگ کا خاصا پورشن چھپ گیا ہے۔ یہ ایک ایسا سفر تھا جس کے بعد ہماری Engagement Diary فروری کے اختتام تک Appointments سے بھر گئی تھی۔ میرا کام بڑھ گیا تھا فلائیٹ بک کروانا ہوٹل میں روم بک کروانا سفر کا سامان باندھنا وغیرہ اس زمانے میں اتنا آسان نہیں تھا آج تو گھر بیٹھے Online سبھی کام

انگلی کے اشارے پر ہو جا رہے ہیں ان دنوں دلی میں انٹرنیشنل بک فیئر 19 تا25 جنوری کے درمیان ہونے والا تھا اس میں ششیندر بھی شامل ہونے والے تھے ہم 20 کی صبح دلی کے لیے روانہ ہوئے اشوکا ہوٹل میں ٹھہرے تھے وہاں سے بک فیر گئے یہ سب کچھ لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ ایک Writer کو یہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے جو لوگ ذہنی، علمی وادبی کام کرتے ہیں ان کے لیے بڑا وقت گزاری کا کام ہے ہاں کوئی یہ تمام کام ذمہ داری سے کر دیتا ہے تو Writer کے لیے ایک نعمت ہے۔

ششیندر جب آندھرا سے باہر ہوتے تو تلگو کے جو نئے شاعرانت پورنرسا پیٹ وغیرہ کے وہ انہیں پوسٹ کارڈ لکھتے تھے اشوکا ہوٹل چانکیہ پوری، دہلی میں بھی آندھرا سے خط آتے رہے۔ دوسری جگہوں سے بھی اشوکا کے Suite میں ایک کھڑکی کے سامنے بیٹھے ششیندر ان خطوں کا جواب لکھتے تھے ایک خط میں انہوں نے لکھا ''مجھے جے پور چھوڑ کر ایک عرصہ ہوا لیکن جے پور کی یادیں اب بھی میری آنکھوں میں جھلملا رہی ہیں۔ میرے خواب اس مختصر سے عرصے میں آپ لوگوں سے مل کر مطمئن نہیں ہوئے میں تو چاہتا تھا کہ آپ سب کے ساتھ بیٹھوں، آپ کے ساتھ گھنٹوں گزاروں، ہم سب باتیں کریں، اپنے دیس کے بارے میں، اپنے لوگوں کے بارے میں اور اپنے مصنفین کی ذمہ داریوں پر بات کریں۔ میں بہت آزردہ تھا جب میں پلین میں بیٹھ کر دہلی جا رہا تھا، کیوں کہ ہماری ملاقاتیں ادھوری ہیں میں جے پور گیا تھا تو میری خواہش تھی کہ وہاں کے اور بھی دوسرے Writers سے ملوں۔ مجھے ایسا لگا جیسے ہم ایک درخت کے پنچھی ہیں اپنے اپنے گھونسلوں میں رہتے ہیں اپنے اپنے گیت گاتے ہیں ایک دوسرے کے پنکھ چومتے رہتے ہیں بھلے ہی ہماری آوازیں الگ ہوں گیت ایک ہو ایک ہی بات ہو میرے خواب تو یہی تھے۔ وقت آ گیا ہے وطن پکار رہا ہے ہم ہندوستانی قلمکاروں کو اپنی ذمہ داریاں سمجھنا ہوگا آپ جہاں بھی رہیں اپنے قلم کے ذریعہ ایک چین بنائیں ایک دوسرے کو خط لکھیں، ملا کریں، انٹرنیٹ پر فیس بک پر اور دیکھیں کہ ہم سماج میں کتنا بدلاؤ لا سکتے ہیں''۔

ششیندر کی نظمیں ہندی اور اردو میں آئیں نادیشمو نا پر جلو میری دھرتی میرے لوگ کا اردو ترجمہ اختر حسن نے کیا۔ انڈین لینگوئجس فورم، گوشہ محل، حیدرآباد سے اشاعت عمل میں آئی۔ یہ دسمبر 1976ء کی بات ہے۔ اس نظم کا ترجمہ اردو میں آنے سے قبل ایک صاحب ہمارے پاس آئے باتوں باتوں میں ہماری بات ترجمے اور ششیندر کی مشہور نظم کے ترجمے تک پہنچی۔ انہوں نے کہا ''اس میں کیا مشکل ہے'' یہ نظم ہندی میں تو آ ہی گئی ہے اب آپ اور ہم دونوں اسے اردو میں لائیں گے'' میں تذبذب میں رہ گئی ایک لمحے کے بعد میں نے بڑی نرمی سے کہا ''دیکھئے! کسی بڑے شاعر پر لکھنے والا یا اس کا ترجمہ کرنے والا بھی اتنا ہی بڑا شاعر ہونا چاہیے۔ کوئی اور اگر لکھتا یا ترجمہ کرتا ہوا سے وہ بلندی حاصل نہیں ہو سکتی جو شاعر نے اپنی نظم کو دی ہے۔ نظم کا ترجمہ تو بڑا مشکل کام ہے ''میری دھرتی میرے لوگ'' پر پیش لفظ لکھتے ہوئے سردار جعفری نے ششیندر کو کس طرح خراجِ تحسین پیش کیا ہے اس کا ایک چھوٹا سا نمونہ ملاحظہ ہو:

> ''ایک بلند قامت شاعر کی بلند قامت تخلیق میرے سامنے ہے۔ یہ بات قابل رشک ہے کہ تلگو زبان میں ایسی دولت ہے اور اس حقیقت میں میرے لیے ایک حیرت ناک مسرت ہے کہ تلگو زبان کا یہ حساس اور جمال پرست شاعر جو انقلابی جلال کی بلندی تک جاتا ہے اور جس کا دل انسانی محبت کے نور سے جگمگا رہا ہے میرا ہم عصر ہے شاید یہ کہنا بہتر

ہے کہ میں اس کا ہم عصر ہوں''۔

اختتامی پیراگراف میں انھوں نے بھی وہی بات کہی ہے جو میں نے ،ششیند رنے کہی:

''ہندوستان کی زبانوں کے درمیان براہِ راست ترجمے کے ذریعہ سے یہ لین دین اگر اور بڑھے تو ہمارے ادب وشعر کو فائدہ پہنچے گا''۔

ششیند ر بنیادی طور پر کسان گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ششیند رخود اپنی اس نظم کے بارے میں لکھتے ہیں:

''یہ ایپک جو میں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ یہ میرا خون جگر ہے جسے میں نے اپنی زندگی کے ماہ و سال اپنی فکر و دانش اپنے تجربے اور مشاہدے اور دوسری ساری باتوں سے نچوڑ کر الفاظ کے رگ وپے میں دوڑا دیا ہے''۔

ششیند ر نے نہ صرف ترجمے کی سفارش کی ہے خود انہوں نے کئی ترجمے کیے، جن میں فارسی شاہنامے سے ''سہراب'' بودلیر کی نظموں کا تلگوترجمہ پداوالوکویتا لو،چینی چند رزمیہ نظموں کا تلگوترجمہ پرینچا کویتا،میگھ دوت کا انگریزی ترجمہ وغیرہ۔

OOO

سلمیٰ صنم

کا

افسانوی مجموعہ

پانچویں سمت

قیمت: -/200روپے

عرشیہ پبلی کیشنز۔دہلی

نخلستان کی تلاش،''ایک ممنوعہ محبت کی کہانی''

''خدا کے سائے میں آنکھ مچولی''

کے بعد

رحمٰن عباس

کا

تہلکہ خیز ناول

روحزن

قیمت:-/350

ملنے کا پتہ:

ممبا بکس انڈیا،ممبئ

0932226262

عرشیہ پبلی کیشنز۔دہلی

غالب شناس یا غلبچی

غالب شناسی کا آغاز تو مولانا حالی کی ''یادگارِ غالب'' سے گزشتہ صدی میں ہو گیا تھا لیکن غالب پرستی ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے مشہورِ عالم مقالے ''محاسنِ کلامِ غالب'' سے شروع ہوئی۔ یہ مقالہ پہلی بار مولوی عبدالحق کے رسالے ''اردو'' میں جنوری ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا۔ پھر دیوانِ غالب کے مشہورِ عالم ''نسخۂ حمیدیہ'' کے ساتھ بطور مقدمہ چھپا۔ اس کے بعد کتابی صورت میں اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ بجنوری نے غالب کی کچھ ایسے مبالغہ آمیز انداز میں تعریف کی کہ غالب کو سوچے سمجھے بغیر پسند کرنا فیشن میں داخل ہو گیا۔ بعض شاعروں نے غالب کے انداز اور غالب کی زمینوں میں غزل گوئی کو شاعری کی معراج سمجھ لیا، اور یہ نہ سوچا کہ بڑے شاعر کی تقلید کا فائدہ بھی بڑے شاعر ہی کو پہنچتا ہے کہ اس کی خوبیاں، مقلدین کی خامیوں کی وجہ سے مزید واضح ہو جاتی ہیں۔ مقلد ہمیشہ خسارے میں رہتے ہیں کہ ان کے ذاتی جوہر کو ابھرنے کا موقع نہیں ملتا۔ لکھنو کے مقلدین غالب سے جب یاس یگانہ چنگیزی کی معرکہ آرائی ہوئی تو یگانہ نے ان شاعروں کے ساتھ ساتھ خود غالب سے بھی جو ناگفتہ بہ سلوک کیا، وہ ''غالب شکن'' کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ اس معرکہ آرائی کا حاصل ایک لفظ ''غلبچی'' ہے جو یگانہ نے ان لوگوں کے لیے وضع کیا جو بلا سوچے سمجھے غالب کی تعریف کرتے ہیں۔ یگانہ نے غلبچیوں کے خلاف اتنا کچھ لکھا کہ بقولِ خود، ان کا قلم گھس جانے کے باوجود تیز سے تیز تر ہوتا گیا۔ کہتے ہیں:

دل کتنوں کے چٹنی ہوئے پستے پستے
بہ بہ گئیں غم سے آنکھیں رستے رستے

کیا لاگ غلبچیوں سے رکھتا ہے قلم
تیز اور ہوا جاتا ہے گھستے گھستے

اب یگانہ رہے نہ مقلدینِ غالب۔ بس غلبچی رہ گئے ہیں جو آئے دن غالب پر کتابیں اور مضامین لکھ لکھ کر غالبیات کی بجائے غلبچیات کے انبار لگاتے رہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پاک و ہند کے نقادوں اور محققوں کو کسی حکیم نے نسخے میں لکھ کر دے دیا ہے کہ کلام غالب کو سمجھو نہ سمجھو، اس پر لکھو ضرور۔ نتیجہ یہ ہے کہ جسے لکھنے کے لیے کوئی موضوع نہیں ملتا، وہ غالب پر طبع آزمائی کر کے اپنی سخن فہمی کا بھانڈا چوراہے میں پھوڑتا ہے۔ اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ محققوں اور نقادوں کی کوششوں سے غالب کو اس کے گناہوں کی سزا اسی دنیا میں مل گئی۔ اب اس کا داخل جنت ہونا یقینی ہے۔ غالب کو جنت میں جانے کے یوں تو بے شمار فائدے ہوں گے، لیکن سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ محققوں اور نقادوں سے جان چھوٹ جائے گی۔

ایسا نہیں ہے کہ غلبچیوں کے موجودہ دور میں غالب شناس نہیں رہے۔ ہیں مگر بہت کم۔ دو غالب شناس تو ہمارے شہر کراچی ہی میں ہیں۔ ایک افتخار احمد عدنی اور دوسرے آفتاب احمد خان، افتخار احمد عدنی سول سروس سے وابستہ ان چند افراد میں سے ہیں جنھوں نے دنیاوی جاہ و حشم کی بجائے علم اور ادب سے رشتہ جوڑا۔ سرکاری مصروفیات سے جو وقت بھی بچتا تھا، وہ اسے پڑھنے لکھنے میں صرف کرتے تھے اور اب جب کہ وہ ملازمت کی زنجیر سے آزاد ہو چکے ہیں، ان کا سارا وقت علمی مشاغل کی نذر ہوتا ہے۔ تصوف سے بھی انھیں علمی و عملی شغف ہے۔ خلوت میں صوفیہ کے

ملفوظات پڑھتے ہیں اور جلوت میں قوالوں کے ساتھ عالمِ وجدو حال کی سیر کرتے ہیں۔ قوالی سے انھیں اتنی دلچسپی ہے کہ جس سرکاری دفتر کے سربراہ بنے، وہاں سارے کلیدی عہدوں پر قوالوں کو بٹھادیا۔ان کے عہدِ اقتدار میں قوال ہمیشہ خوش حال رہے۔ نیاز مندی کے باوجود ہم جو بے روزگار رہے تو اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ اور نہیں کہ ہم قوالی کی محفلوں میں تو شریک رہے، قوالوں کے کسی گروہ میں شامل نہ ہوسکے۔قوالی سے عدنی صاحب کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے کسی نے خوب کہا تھا کہ اگر ملک کی مزید خوش حالی کے خیال سے کبھی عدنی صاحب وزیرِ اعظم بن گئے تو ان کی کابینہ قوالوں پر مشتمل ہوگی، اور ان قوالوں پر یہ پابندی ہوگی کہ وہ صرف جمیل الدین عالی کا کلام گایا کریں۔

اردو ہی عدنی صاحب کے گھر کی زبان نہیں ہے، فارسی سے بھی ان کا تعلق گھریلو نوعیت کا ہے کیوں کہ وہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے پرپوتے ہیں۔ وہی شیفتہ جن کا یہ شعر

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

عدنی صاحب کے بچپن میں گھر میں شیفتہ کو دادا جان کہہ کے یاد کیا جاتا تھا چوں کہ جدّ امجد کا نام لینا سوءِ ادب میں داخل تھا، اس لیے جب عدنی صاحب اس شعر کو پڑھتے تھے تو پہلے مصرعے کی یہ صورت ہوتی تھی:

شاید اسی کا نام محبت ہے دادا جان

انھیں دادا جان کی سخن فہمی کی داد غالب نے اس طرح دی ہے:

غالب بہ فن گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او
ننوشت در دیواں غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نہ کرد

اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ غالب کو اپنی شاعری کے باب میں اس قدر افزائی پر ناز ہے کہ اس نے اپنے دیوان میں کوئی غزل اس وقت تک درج نہ کی جب تک اسے مصطفیٰ خاں شیفتہ نے پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھ لیا۔

اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ عدنی صاحب کو سخن فہمی اور غالب شناسی کی دولت ورثے میں ملی ہے جس کا بھرپور مصرف ان کی اس کتاب میں ہوا ہے جو حال ہی میں ''غالب شناسی کے کرشمے'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کا ذکر تو ہم بعد میں کریں گے، پہلے ذرا کراچی کے دوسرے غالب شناس آفتاب احمد خاں کے بارے میں بتادیا جائے کہ وہ غالب شناسی کے کس مرتبے پر فائز ہیں۔

آفتاب احمد خان نام کے دو غالب شناس ہیں۔ ایک اسلام آباد میں ہیں جنھیں تحریری غالب شناس کہا جاسکتا ہے۔ انھوں نے غالب کے علاوہ ن۔م۔راشد اور محمد حسن عسکری پر بھی کتابیں لکھی ہیں۔ کراچی والے آفتاب احمد خان زبانی غالب شناس ہیں۔ انھوں نے غالب پر کبھی کچھ لکھا تو نہیں لیکن غالب نے جو کچھ لکھا ہے اور غالب پر جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ انھوں نے نہ صرف پڑھ رکھا ہے بلکہ حافظے میں محفوظ بھی ہے۔ غالب کے صرف شعر ہی نہیں، نثر بھی انھیں ازبر ہے۔ اگر انھیں چلتا پھرتا غالب انسائی کلوپیڈیا کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ شاید مصروفیات کی وجہ سے انھیں لکھنے کا موقع نہیں ملتا مگر جب بولنے پر آتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے علم کا دریا بہہ رہا ہے اور دریا بھی ایسا جو غالب کے دریائے معاصی کی طرح تنک آب نہیں ہے۔

آفتاب صاحب بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ سنا ہے کہ سرکاری فائلوں اور میٹنگوں میں وہ غالب کے شعروں سے بہت کام لیتے تھے۔ سرکاری اہل کار غالب کے شعروں کو نہ سمجھنے کی وجہ سے آفتاب صاحب کی آرا سے عموماً اتفاق کرلیتے تھے۔ ۱۹۸۶ء میں دہلی میں انتظامی اصلاحات کے بارے

میں جو سارک کانفرنس ہوئی تھی، اس میں پاکستانی وفد کی قیادت آفتاب صاحب نے ہی کی تھی۔ کانفرنس میں انھوں نے اپنی تقریر میں غالب کے شعر اس کثرت سے استعمال کیے تھے کہ اہل کانفرنس غالب کو کوئی ایسا مفکر سمجھے جو انتظامی مسائل پر درجہ استناد رکھتا ہے۔

آفتاب صاحب خود کچھ نہیں لکھتے تو کیا ہوا، اسلام آباد والے ان کے ہم نام کی کتابوں کو لوگ انھیں کی تصانیف سمجھتے ہیں۔ یہ ہمارا چشم دید واقعہ ہے کہ جن دنوں اسلام ااباد والے آفتاب احمد خان کی کتاب ''غالب آشفتہ نوا'' شائع ہوئی تھی، ایک محفل میں ایک صاحب نے کراچی والے آفتاب احمد خاں کو اس کتاب کی اشاعت پر مبارک باد دی جو انھوں نے شکریے کے ساتھ قبول کی۔ ان صاحب نے یہ بھی کہا: ''آپ تو ماشاء اللہ خاصے جوان نظر آتے ہیں لیکن کتاب میں جو تصویر شائع ہوئی ہے، اس سے آپ کی عمر کچھ زیادہ معلوم ہوتی ہے''۔ اس موقع پر افتخار احمد عدنی بھی موجود تھے۔ اس سے پہلے کہ آفتاب صاحب کچھ کہتے عدنی صاحب نے فرمایا: ''کتاب میں ان کی جو تصویر شائع ہوئی ہے، وہ پانچ سال بعد کی ہے۔ پانچ سال بعد جب آپ آفتاب صاحب سے ملیں گے تو وہ تصویر ہی کی طرح نظر آئیں گے''۔

آفتاب صاحب کی دوسری شناخت ان کے قیامت خیز قہقہے ہیں۔ قہقہہ عموماً بات ختم ہونے پر لگایا جاتا ہے مگر آفتاب صاحب گفتگو کا آغاز ہی قہقہے سے کرتے ہیں اور قہقہوں ہی کے درمیان بات مکمل ہو جاتی ہے یا ادھوری رہ جاتی ہے۔ تحریر میں جو کام رموز اوقاف سے لیا جاتا ہے، آفتاب صاحب گفتگو میں وہی کام قہقہوں سے لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے ان سے گفتگو کرنے والا اپنے آپ کو دیوار قہقہہ سمجھنے لگتا ہے کہ شاید اسی کو دیکھ کر قہقہہ باری ہو رہی ہے۔

عدنی صاحب کی مذکورہ بالا کتاب کا انتساب آفتاب صاحب قہقہوں ہی کے نام ہے اور کتاب میں بھی ان کا ذکر اس کثرت سے ہے کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ عدنی صاحب غالب شناس بڑے ہیں یا قہقہہ شناس۔ خیر تو یہ مذاق کی باتیں تھیں، اصل بات یہ ہے کہ عدنی صاحب کی کتاب غالب کے حوالے سے لکھی گئی کتابوں میں ایک منفرد اضافہ ہے۔ منفرد ان معنوں میں کہ یہ کوئی روایتی تنقید کی کتاب نہیں ہے جس میں منشیان تنقید کی طرح باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے غالب کی شاعری کی خصوصیات نمبر وار بیان کی گئی ہوں یا مدرس نقادوں کے انداز میں غالب کے بارے میں ایسی باتیں لکھی گئی ہوں جنھیں پڑھ کر طلبہ کی نصابی ضروریات پوری ہو سکیں۔ بلکہ یہ کتاب ہمیں بتاتی ہے کہ غالب کی شاعری ہماری زندگی میں کس کس طرح اور کن کن مرحلوں میں ہمارا ساتھ دیتی ہے۔ بظاہر تو یہ کتاب مختلف مضامین کا مجموعہ ہے لیکن ان مضامین میں وہی معنوی ربط پایا جاتا ہے جو کسی ناول یا داستان کے مختلف ابواب میں ہوتا ہے۔ جس طرح کوئی ایک باب پڑھ لینے سے پورے ناول یا داستان کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح اس کتاب کے مضامین کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھنے سے کتاب کے اصل مقصد کو سمجھنا مشکل ہے اور کتاب کا مقصد یہ ہے کہ یہ بتایا جائے کہ غالب کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے کیا کیا فائدے ہیں۔ غالب روزمرہ زندگی کے عام حالات ہی میں ہمارا ساتھ نہیں دیتا بلکہ مشکل سے مشکل لمحات میں بھی ثابت قدم رہنے کا سلیقہ سکھاتا ہے اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ گویا غالب کے ساتھ زندگی بسر کی جائے تو نہ صرف بہت سی مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں بلکہ زندگی بسر کرنے کا سلیقہ بھی آ جاتا ہے۔

عدنی صاحب نے اس کتاب میں اپنے اور دوسروں کے بہت سے دلچسپ واقعات بیان کیے ہیں اور غالب کے شعروں سے ان واقعات کا تعلق اس طرح قائم کیا ہے کہ غالب بھی ان

واقعات کا حصہ بن جاتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ڈیڑھ سو سال پہلے کے مصطفیٰ خاں شیفتہ کا ہم عصر نہیں، شیفتہ کے پر پوتے کا معاصر ہے۔ غالب کی اسی خوبی نے اسے آفاقی شاعر بنایا ہے کہ وہ ہر دور اور ہر زمانے میں اسی دور اور اسی زمانے کا شاعر معلوم ہوتا ہے۔

عدنی صاحب کا خیال ہے کہ غالب اتنا بڑا شاعر ہے کہ کوئی بھی فرد اس کی شاعری کے آئینے میں اپنے آپ کو جلوہ گر دیکھ سکتا ہے۔ بہ شرطے کہ وہ دیکھنے والی آنکھ رکھتا ہو۔ اس خیال کی تصدیق اس مضمون سے بخوبی ہوتی ہے جس کا عنوان ہے ''عصمت چغتائی اور غالب''۔ عدنی صاحب نے نہایت دلچسپ پیرائے میں عصمت کی زندگی کے ہر اہم واقعے کا جواز غالب کے کلام میں تلاش کیا ہے۔ یہاں تک کہ مرنے کے بعد نذر آتش کیے جانے کی سند بھی انھیں غالب کے ہاں مل گئی۔ لکھتے ہیں:

''غالب قبر سے اتنا ڈرتے تھے کہ انھیں اصرار تھا کہ اگر ڈوب کے مرنا ان کی قسمت میں نہیں تو انھیں مرنے کے بعد جلا دیا جائے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کیسا واضح شعر کہا ہے۔ قبر سے بچنے کے لیے انھیں کافر بن جانے میں بھی کوئی باک نہیں تھا:

نعشِ مرا بسوز، کم از برہمن نیم
ننگِ نسو ختن نتواں در مزار برد

''میری لاش کو جلا دو کہ میں کسی طرح برہمن سے کم نہیں ہوں۔ میں اس داغ کو قبر میں کیسے لے جاؤں کہ مجھے جلانے کے قابل بھی نہ سمجھا گیا..... غالب نے تو صرف جلائے جانے کی تمنا کی تھی، عصمت نے جل کر دکھا دیا''۔

عدنی صاحب کا اسلوب بیان نہایت دل کش ہے۔ ان کے ہاں علم اور طنز و مزاح کی ایسی آمیزش ملتی ہے جو کسی دوسرے لکھنے والے کے ہاں نظر نہیں آتی۔ مشکل سے مشکل اور سنجیدہ سے سنجیدہ مسئلے پر لکھتے ہوئے بھی وہ طنز کے نشتروں اور مزاح کی پھلجھڑیوں سے اپنے اسلوب کو ایسا باغ و بہار بنا لیتے ہیں کہ پڑھنے والا ہنستا بھی جاتا ہے اور بہت کچھ حاصل بھی کرتا جاتا ہے۔ وہ لوگ جو نثری نظم اور علامتی افسانے کی وجہ سے اردو کے مستقبل سے مایوس ہو چکے ہیں، انھیں یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیے۔

عدنی صاحب نے اس کتاب میں غالب کی کچھ فارسی غزلوں کے منظوم ترجمے بھی شامل کیے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ شعر کا ترجمہ شعر میں کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی زندہ جانور کو ہلاک کر کے اس کی کھال میں بھس بھر دیا جائے اور کہا جائے کہ یہ بالکل اصل کے مطابق ہے۔ شعر کا ترجمہ شعر میں کرنا ممکن ہی نہیں۔ اس کے باوجود عدنی صاحب کے ترجمے ان لوگوں کے لیے ایک ادبی تحفہ ہیں جنھیں فارسی نہیں آتی۔ یہ دوسری بات ہے کہ جنھیں فارسی نہیں آتی ان کے لیے غالب کی اردو شاعری بھی گنبد بے در کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ اسے باہر ہی سے دیکھ سکتے ہیں، اندر داخل نہیں ہو سکتے۔

شاعری کے ترجمے کے حوالے سے ہمیں ایک لطیفہ یاد آ رہا ہے۔ بلا تشبیہ عرض ہے کہ رفیق خاور مرحوم نے علامہ اقبال کے ''جاوید نامہ'' کا منظوم اردو ترجمہ کیا تھا۔ انھوں نے اپنے ایک دوست کو یہ ترجمہ دیا اور چند روز بعد اس کی رائے معلوم کی۔ اس نے کہا ''یہ ترجمہ اتنا عمدہ ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اقبال نے آپ کے اردو متن ہی کو فارسی میں منتقل کر دیا ہو۔ افسوس کہ اکثر جگہ اقبال نے آپ کے مفہوم کو غلط سمجھا۔ نتیجہ یہ ہے کہ سارا فارسی ترجمہ غلطیوں سے پُر ہے''۔

OOO

شاعری

غزلیں

مظفرحنفی

آئینہ درمیان دھرے کون ہے ادھر
یہ کون پوچھتا ہے ارے کون ہے ادھر

ہے اس کو اشتیاق بہت خود نمائی کا
اللہ اس پہ رحم کرے کون ہے ادھر

سیلاب زور پر ہے ادھر عافیت نہیں
پانی وہیں کہیں نہ بھرے کون ہے ادھر

لٹنا تو ہے نصیب کسی نہر کے قریب
یہ قافلہ کہاں ٹھہرے کون ہے ادھر

ایسے نظر نہ آئے گا محسوس کیجیے
بوسیدہ آسماں سے پرے کون ہے ادھر

بیتال کھوجتا ہے مظفر کو دیر سے
اپنے ہی سائے سے نہ ڈرے کون ہے ادھر

محمدعابدعلی عابد

ہم اپنے زخم سے لیتے رہے چراغ کا کام
ہے یہ بھی ایک طرح سے بڑے دماغ کا کام

جہاں میں سارا کا سارا ہے خام مال ترا
کیا تمام تر انساں نے کشت باغ کا کام

جنون در بدری اور کار شیشہ گری
ہے کارعشق و محبت بڑے فراغ کا کام

جو ہم بھی ٹھان لیں دریا کے پار اترنے کی
ہمارے واسطے موجیں کریں الاغ کا کام

نشانیاں ہیں یہ حالات عہد رفتہ کی
متاع یاد کو قائم رکھے ہے داغ کا کام

بشر کا کام محبت سے پیش آنا ہے
فریب دینا ہے عابدؔ زغن کا زاغ کا کام

شاعری

غزلیں

جنوں اشرفی

ریزہ ریزہ اپنا چہرہ مت کرنا
ٹوٹا پھوٹا شیشہ دیکھا مت کرنا
اک دن تم پہچان بھی اپنی کھو دو گے
اپنے ہی سائے کا پیچھا مت کرنا
جتنے ملنے والے ہیں سب اپنے ہیں
بھولے سے بھی ایسا سوچا مت کرنا
اپنے دامن پر بھی چھینٹیں آئیں گی
کیچڑ میں تم پتھر پھینکا مت کرنا
ضبط بھی کرنا گرچہ مشکل ہوتا ہے
اپنے غم کو لیکن رسوا مت کرنا
محرومی کا درد اذیت دیتا ہے
دل کو تم محصور تمنا مت کرنا
خوش فہمی کی عمر بہت کم ہوتی ہے
جامن کی شاخوں پر جھولا مت کرنا
دستار جنوں قدموں پر گر جائے گی
اونچے اونچے گھر کو دیکھا مت کرنا

زندگی آج تک در بدر ہے میاں
کوئی اپنا ٹھکانہ نہ گھر ہے میاں
اپنے شانے پہ جو ایک سر ہے میاں
مرکزِ فکرِ شام و سحر ہے میاں
شام اوڑھی کبھی صبح اوڑھی کبھی
الغرض زندگی اس قدر ہے میاں
مقبرے کا وہ سارا نشاں لے گیا
اب تو تربت مری رہگزر ہے میاں
شام کا اس پہ ہوتا ہے اکثر گماں
سانولی سانولی جو سحر ہے میاں
بخش دیتا ہے مجھ کو وہ بے چینیاں
میرے اندر جو انجان ڈر ہے میاں
حالت ہجر میں آج تک ہیں جنوںؔ
کیا بتائیں کہاں اپنا گھر ہے میاں

شاعری

غزلیں

مسلم نواز

پریشانی کے عالم میں پریشانی کہاں رکھوں
سبھی تو میرے جیسے ہیں میں حیرانی کہاں رکھوں
اُبلتا جا رہا ہے آنکھ کا چشمہ نہیں رُکتا
گناہوں پر پشیماں ہوں پشیمانی کہاں رکھوں
جسے دیکھوں وہی محوِ عبادت ہے یہاں ہر دم
سبھی ہیں متقی تو حرفِ شیطانی کہاں رکھوں
فقیری میں نہ جانے کتنے ماہ و سال گزرے ہیں
ملا ہے آج مجھ کو قصرِ سلطانی کہاں رکھوں
نہ جانے کس گھڑی میرا حسیں جذبہ اُبھر آئے
میں اپنے جذبۂ دل کی یہ طغیانی کہاں رکھوں
نئی تہذیب لوگوں کو نہ کر دے برہنہ اک دن
میں نسلِ نو کے جسموں کی یہ عریانی کہاں رکھوں
جھکا لیتا ہے مسلم شرم سے خود اپنی نظروں کو
بچا ہے آنکھ میں تھوڑا سا جو پانی کہاں رکھوں

شاہد پٹھان

ہم نے توحید کی قندیل جلا رکھی ہے
قصرِ نمرود کی بنیاد ہلا رکھی ہے
زندگی اپنی خوش آئند بنا رکھی ہے
آس ذروں نے ستاروں سے لگا رکھی ہے
گھر کی تاریکئ افلاس مٹا رکھی ہے
''ہم نے اک شام چراغوں سے سجا رکھی ہے''
اس کی تابانی سے روشن ہے گزر گاہِ حیات
ہم نے امید کی جو شمع جلا رکھی ہے
اہلِ باطل کو مقدر کی ہے اس نے دوزخ
اہلِ حق کے لیے فردوس سجا رکھی ہے
ہم نہیں آتشِ نمرود، سے ڈرنے والے
ہم نے یہ بات زمانے کو بتا رکھی ہے
عشق میں ہم نے لٹایا ہے بہت کچھ لیکن
اپنے ''ایمان'' کی میراث بچا رکھی ہے
جانے کیوں لوگ سمجھتے ہیں مسیحا اس کو
ظلم کی جس نے ہر اک رسم روا رکھی ہے
ہم سے دیوانوں کو توفیق وفا دی اس نے
حسن والوں میں تغافل کی ادا رکھی ہے
مجھ کو توفیق سخن دی ہے اسی نے شاہد
جس نے ان چاند ستاروں میں ضیا رکھی ہے

شاعری

غزلیں

جمیل نظام آبادی

زندگی کس موڑ پر لائی ہے کس کو کیا پتہ
چوٹ دل نے کس جگہ کھائی ہے کس کو کیا پتہ

ہنستے ہنستے اس سے رخصت ہو رہا تھا یاد ہے
دفعتاً کب آنکھ بھر آئی ہے کس کو کیا پتہ

فاصلہ رکھتے ہوئے سب سے ملو ہنستے ہوئے
کون دشمن کون شیدائی ہے کس کو کیا پتہ

بے وفاؤں میں ہمارا نام شامل ہے مگر
اس میں کس کس کی رسوائی ہے کس کو کیا پتہ

وہ جو میری راہ کی دیوار بنتا ہے بہت
وہ تو میرا اپنا ہی بھائی ہے کس کو کیا پتہ

کوئی لیتا ہی نہیں ہے اب دوانوں کی خبر
وقت بھی شاید تماشائی ہے کس کو کیا پتہ

پھول سے خوشبو سے رنگ و نور سے مہتاب سے
میری کس کس سے شناسائی ہے کس کو کیا پتہ

میں تو تیرا ہوں تجھے ہی چاہتا ہوں اے جمیلؔ
دل مگر کس کا تمنائی ہے کس کو کیا پتہ

پہلے دل اپنا تھام لیتے ہیں
اور پھر تیرا نام لیتے ہیں

ان کو لفظوں کی کیا ضرورت ہے
جو نگاہوں سے کام لیتے ہیں

آم تو آم آج کے تاجر
گٹھلیوں کے بھی دام لیتے ہیں

ہوش کھوتے نہیں کبھی پی کر
ہم دکھانے کو جام لیتے ہیں

کامیابی ہے ان کے حصے میں
جو سلیقے سے کام لیتے ہیں

انؐ کی سنت معاف کرنا ہے
ہم کہاں انتقام لیتے ہیں

میں بھی شامل جمیلؔ ہوں ان میں
جو محبت سے کام لیتے ہیں

شاعری

غزلیں

اختر شاہجہاں پوری

صدی کی میزان پر رہا ہے
جو لمحہ مجھ پر گزر رہا ہے

نگارِ غم حرف دل پر
بصورتِ وحی اُتر رہا ہے

سنور رہا ہے جو آئینے میں
وہ اہلِ بنیش سے ڈر رہا ہے

جو مجھ کو پیارا تھا زندگی سے
وہ لفظ قسطوں میں مر رہا ہے

وہ صحرا صحرا گھٹا کی صورت
ہمارا ہی ہمسفر رہا ہے

اسی کو دشمن سمجھ رہا ہوں
جو مجھ کو بیدار کر رہا ہے

متاعِ صبح یقیں کی صورت
وہ تیرگی سے اُبھر رہا ہے

مجھے زندگی کا پتا دے گیا
وہ ہاتھوں میں بجھتا دیا دے گیا

کوئی عکس جس میں اُبھرتا نہ تھا
وہ اس آئینے کو جلا دے گیا

مری خاک تو اتنی نم بھی نہ تھی
مگر وہ تو پیکر نیا دے گیا

پرندہ فضا میں جو گم ہو گیا
مری فکر کو راستا دے گیا

میں اب خون کا کس پہ دعویٰ کروں
کہ جب وہ مجھے خوں بہا دے گیا

زمیں پر بلندی سے آنا تیرا
تری عظمتوں کا پتا دے گیا

مرے دل پہ اختر نہ دستک ہوئی
صدا دینے والا صدا دے گیا

شاعری

نظمیں

جمیلہ نشاط

یہ جنگ وسائل کی جنگ ہے

اس دور میں ہم سب زندہ ہیں
یہ دور ہے دیکھو تصادم کا
وہاں جلد کی رنگت دیکھتے ہیں
یہاں ذات ہے کیا وہ پوچھتے ہیں
سرحد پر گر ہم دیکھیں گے
شعلوں کی بارش ہوتی ہے
برفیلی ہواؤں میں دیکھو
بارود ہے اور خنجر ہے
بنکوں کے آگے قطاروں میں
بھیڑ سے سب ٹکراتے ہیں
دوجے کو نیچا دکھا کر وہ
خود آگے بڑھ جاتے ہیں
مشین یہ بھی کہتا ہے
پیسہ نہیں مل سکتا ہے
بچے کھیلیں تو کیسے
موبائیل ہے اور کارٹون ہے
ہر شخص پریشاں لگتا ہے
یہاں نفرت اور کدورت ہے
یہ جنگ وسائل کی جنگ ہے
مٹی پانی اور ہوا
جو چھین لیا سو چھین لیا!
اس نیلے گولے پر ہم
چین کیسے پائیں گے
ہم زندہ ہیں اور حیراں ہیں
جائیں تو کہاں ہم جائیں گے

اسنیٰ بدر

ان دنوں جانے کیا ہو رہا ہے مجھے
میری تنہائی جو ایک مدت سے دل میں
سکوں ریز تھی گو بلا خیز تھی
جانے کب کن دنوں میں بڑی ہو گئی
سامنے آ کے اک دم کھڑی ہو گئی
میں نظر اپنی اس سے چراتی ہوئی
کھینچ کر اپنا دامن چھڑاتی ہوئی
گام زن تیز ہوں فکر انگیز ہوں

☆☆

میں اپنی پلیٹ میں بریانی ڈال رہی ہوں
الپو میں فاطمہ اپنے ایک بچے کی لاش
ڈھونڈ رہی ہے
میں کھانے کے بعد بستر پر دراز ہوں
فاطمہ کے ماتھے سے خون رس رہا ہے
اس کا بارہ سال کا بیٹا اسے تسلی دے رہا ہے
ایک دو سالہ زخمی بچہ حیرت سے تک رہا ہے
مجھے آج ایک فنکشن میں جانا ہے
وہاں ڈانس اور گانوں کا پروگرام ہے
دیر رات تک یہ فنکشن چلے گا
میں لوٹ کے بہت تھک جاؤں گی
تب تک شاید فاطمہ کو بھی اپنے بچے کی لاش مل جائے
لوٹ کر میں فیس بک ضرور چیک کروں گی
مجھے فاطمہ کی بہت فکر ہے

شاعری

نظم

انیس پروین

"ICCU"

کے پس منظر میں

ڈوبتی نبضیں
ٹوٹتی سانسیں
گھٹتی، بڑھتی سی دھڑکن!
سہما سہما سا سناٹا
جیسے وہ ہو سوگ منانا!
آکسیجن کی سرسراہٹ
مانیٹر کی پپ پپ (Pip - Pip)
سانس کی آڑھی ترچھی لکیریں
بنتی، بگڑتی سی تقدیریں
آس پاس ہیں جتنے چہرے
افسردہ، رنجیدہ سے
خوفزدہ، پژمردہ سے!
اک پل کو ہے آس سی بنتی
دوسرے پل، مٹ جاتی ہے
ہردم موت ہے دستک دیتی
زیست کہیں، چھپ جاتی ہے!

آنکھ مچولی میں دونوں کی
جان پہ بن بن جاتی ہے!
ایک سانس کی ڈور سے
وابستہ، کتنے ہیں رشتے؟
خون کے ہیں کچھ
پیار کے ہیں کچھ
کچھ ہیں درد کے رشتے!
کچھ رشتے ایسے بھی ہیں
کوئی نام، جنھیں نہیں دے سکتے ہم
لیکن پھر بھی وہ رشتے ہیں!
ٹوٹ گئی گر ڈور سانس کی
بکھر کے رہ جائیں گے سب!!!

احمد رشید

افسانہ

ابتدا کی طرف واپسی

میت کی تجہیز و تکفین کے بعد، دعائے مغفرت ہوئی۔
آہستہ آہستہ لوگ واپس ہو گئے کہ واپسی ان کا مقدر ہے۔ قبرستان میں سناٹا پھیل گیا۔ درختوں کے درمیان سے نکل کر سر پر تیز دھوپ کا بوجھ لیے اپنے بوجھل قدموں کو دھیرے دھیرے سمیٹتے ہوئے قبرستان کے دروازے پر آ گیا۔ سر کو ہاتھوں کی رحل میں رکھے تین سیڑھیوں والے زینہ کے آخری پائیدان پر پریشان حال بیٹھ گیا۔ چہرے کے ورق ورق پر چنتا درج ہے دونوں آنکھوں میں آنسو رکھے ہیں۔ کائنات کی بے ثباتی اور زندگی کے عارضی ہونے کے احساس سے حیران و پریشان ہو کر وہ سوچنے لگا سب بیکار ہے۔ کائنات بے حقیقت اور حیات بے معنی۔ سب فانی، باقی ہے صرف ذات اللہ کی۔ اچانک آہٹ ہوئی، سر اُٹھایا، آنکھیں وا کیں، سامنے کھڑی پُرنور شخصیت کو اپنی نگاہوں کے دائرے میں سمیٹنے کی کوشش کی۔ ایک سفید ریش انسان، رنگ برف کی مانند، چمک دار آنکھیں، کشادہ پیشانی کی سرخی کے درمیان سیاہ گول نشان، جنت نشاں، سفید برّاق لباس، کرتا گھٹنوں سے نیچا، پائجامہ ٹخنوں سے اونچا، کُرتے کی جیب سے مسواک کا سر جھانک رہا ہے:

"تمہارے غم زدہ ہونے کا مجھے کوئی غم نہیں،
کیوں کہ راستہ گھر کو گیا ہے اسی ویرانے سے،
انسان کو گود میں بھی گور کی یاد رہنی چاہیے۔
گورستان کی وحشت یاد رکھنے سے موت کی
دہشت ختم ہوتی ہے۔"

اس کے گوش میں نور کی بوندیں ٹپکاتے ہوئے بزرگ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا، ایک نور کی لکیر برق رفتاری سے اس کی آنکھوں میں داخل ہوئی جسم کی تمام شریانوں میں دوڑ دھیا لہر کی طرح پھیل گئی۔ اس روشنی میں اس نے اپنی زندگی کے اندھیروں کا احتساب کیا۔ دل بے چین، قلب بے سکون ہوا۔ وہ سبک سبک رونے لگا... آنسوؤں کے راستے سیاہی رفتہ رفتہ زائل ہوئی۔ وہ اُٹھا، بزرگ نے کمر پر دائیں ہاتھ رکھا ان کے ساتھ ساتھ دھیرے دھیرے نظر جھکائے چلنے لگا۔ اچانک دھیان آیا وہ جھٹکے کے ساتھ بزرگ کے بائیں جانب آ گیا۔ راہ گیروں سے بے خبر وہ نہایت خاموشی سے باادب چل رہا ہے۔

بزرگ گویا ہوئے "میزان حقوق العباد پر بنے گی اور تمہاری آزمائش حقوق اللہ میں ہے۔ خدمتِ خلق کائنات کی سب سے بڑی عبادت ہے۔ کتاب و سنت کی اتباع میں اللہ کی رضا ہے۔ ہر باطن، جس کا ظاہر مخالف ہے باطل ہے۔ ذکر و فکر اور شکر فصل کو وصل میں بدلنے کا راستہ ہے۔"

شرابِ طہورہ میں اس کا روم روم ڈوب گیا۔ اس کی آنکھیں نشہ کی کیفیت سے بند ہو گئیں جب کھلیں تو گھر کے دروازے پر تنہا کھڑا تھا...... کیا تھا؟...... کیا ہوا؟...... خواب تھا؟......حقیقت تھی!......غم تھا نہ خوشی۔ بس ایک ناقابلِ بیان سرور کا احساس باقی تھا۔

گھر میں داخل ہوا۔ بوسیدہ دیواریں چڑیلوں کی طرح کالے کالے دانت نکالے، خوف ناک قہقہے لگا رہی ہیں، برسوں سے ان میں ٹیپ بھری گئی اور نہ مرمت ہوئی۔ قلعی ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ڈیڑھ یا دو فٹا پتلے زینے کی نو سیڑھیاں چڑھ کر چھ بائی نو کا چھوٹا سا کمرہ جو مہمان خانہ بھی ہے، میں چار بائی چھ کے ایک تخت پر پرانا سا بستر بچھا ہے جس پر بوڑھے والد عمر تقریباً اسّی سال لیٹے بیٹھے، سوتے جاگتے، نماز و تسبیح پڑھتے رہتے ہیں۔ کھانا

پینا، چیخ و پکار، سخت کلامی اسی تخت پر بیٹھ کر کرتے ہیں۔ اب بھی تخت پر بیٹھے تسبیح کے دانے اُلٹ رہے ہیں۔

''السلام علیکم'' اس نے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیری والدین کو مسرور نگاہوں سے دیکھنے سے ایک مقبول حج کا ثواب ملتا ہے اور جتنی بار دیکھا جائے گا۔ اتنے ہی مقبول حجوں کا ثواب ملے گا۔

''وعلیکم السلام'' اپنی گدیلی سی بڑی بڑی آنکھیں کھولیں جو کبر سنی کی وجہ سے خرگوش کی طرح چھوٹی چھوٹی دکھائی دے رہی ہیں۔

''بڑی دیر لگا دی، کہاں گئے تھے؟'' ابّا نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''میرے ایک دوست کا انتقال ہوگیا۔ رات کے آخری حصہ میں بے چینی ہوئی، دل گھبرایا، ہارٹ اٹیک ہوا، موت واقعہ ہوگئی، فرسٹ ایڈ کی بھی مہلت نہیں ملی۔'' اس نے آہستہ آہستہ روداد سنائی جس کے ایک ایک لفظ سے درد ٹپک رہا ہے۔

بوڑھا شخص خاموش بیٹھا اسے ٹکر ٹکر دیکھ رہا ہے اس کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو بہہ رہے ہیں۔۔۔۔

''کیوں روتا ہے؟ اللہ کی امانت تھی اس نے واپس لے لی۔'' اچانک باریش بزرگ کی آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔

اس نے جلدی جلدی آنسو پونچھے، امّی کی تلاش میں ادھر اُدھر آنکھیں چلائیں۔ دوسرے کمرے کے دائیں جانب دروازے پر نظر ڈالی۔ اسٹوو کی سَن سَن میں روٹی پکنے کی پھٹ پھٹ کی آواز دب رہی ہے۔ کمزوری اور بیماری کی وجہ غریبی ہے، حالاں کہ بوڑھا ہونے کے لیے ساٹھ سال کوئی زیادہ عمر نہیں ہوتی۔ مگر وہ کیا کرے؟ جو نصیب میں لکھا ہے وہی تو ہو رہا ہے۔ اگر دولت صرف محنت سے ملتی تو ہر مزدور دولت مند ہوتا۔ دولت کا تعلق قسمت سے جڑا ہے...... وہ سوچتا ہے اماں کو کھانسی کا ٹھکا، ابّا کو استھما۔ جب انھیں پھندا لگتا، سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے...... چہرہ انگارے جیسا سرخ، آنکھوں سے سرخی مائل پانی، سینہ پر دونوں ہاتھ رکھے جیسے دل کو دبانے یا روکنے کی ناکام کوشش کے اس منظر کو دیکھ کر آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں......اس کے علاوہ چارہ کیا ہے، سوائے صبر و شکر کے؟ وہ والدین کی خدمت میں حاضر باش رہتا۔ باپ باب الفردوس، ماں کے پیروں تلے جنت، مسلمان کے لیے یہی تحفۂ آخرت بھی ہے۔

پڑوسیوں کا خیال رکھنا، مخلوق کے ساتھ حسنِ اخلاق کے ساتھ پیش آنا، پنج گانہ نماز باجماعت خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کرنا اس کی زندگی کا معمول تھا لیکن باریش بزرگ کے دیدار کے بعد معمولات نے عادت کی صورت اختیار کر لی جس میں خلوصِ نیت اور خشیت بھی شامل ہوگئی ہے۔ ادھر کچھ عرصہ سے بے چینی کی شدت میں اضافہ ہوگیا ہے۔ شب بیداری نیند سے راضی بارضا کا معاملہ ہوتا ہے، یہاں تو نیند پر شب خوں راضی بے رضا کا سلسلہ سا بن گیا ہے۔ ان دنوں چین کے ساتھ نیند بھی کھوگئی ہے۔

''بیٹا اُٹھ جا، اذان ہونے والی ہے۔'' اماں نے آواز لگائی۔

''میں جاگ رہا ہوں۔'' وہ اُٹھا...... جاڑوں کی آدھی رات گزر چکی ہے، وضو کیا، تہجد پڑھی۔ ابھی فجر ہونے میں چار گھنٹے باقی ہیں۔ اماں کو بڑھاپے اور کمزوری کی وجہ سے نیند نہیں آتی، اُٹھا کر خود سوگئی، چڑیا جیسی نیند اور جگار......ابا جاگتے زیادہ ہیں، زیادہ کھانسی یا دماغی خشکی کی وجہ سے۔ لیکن یہاں نہ بڑھاپا ہے، نہ کھانسی نہ دماغی کمزوری۔ بستر پر لیٹے ہوئے بھی ذہن جاگتا ہے۔ وہ جاے نماز پر بیٹھا رہا...... تلاوتِ قرآن کرتا رہا... یادِالٰہی میں مصروف رہا۔ فجر کی اذان ہوئی...... باجماعت نماز پڑھنے کے لیے مسجد دوڑ لگائی......اشراق کی نماز ادا کر کے گھر واپس ہوا۔ اماں دسترخوان لگائے انتظار کر رہی ہے۔ خشک بیسنی روٹی ایک چھوٹی سی تھالی میں رکھی ہے......دو پیالیوں میں چائے سے بھاپ نکل رہی ہے۔

''بیٹا تجھے پسند ہے! بیسنی روٹی خستہ ہوتی ہے آسانی

سے چبنے میں آجاتی ہے...... تیرے ابا کا بھی اسی سے پیٹ بھر جاتا ہے۔'' اماں نے دھیرے دھیرے بات کہی۔

وہ اماں کی باتوں کو خوش اخلاقی سے سن رہا ہے۔ سوچ رہا ہے بیسنی روٹی مجھے اصلی گھی میں تر پسند ہے... لیکن اصلی گھی مہنگائی کی وجہ سے نصیب کہاں! بچپن سے مزدوری کی، ابا بھی مزدوری کرتے تھے دونوں کی کمائی ملا کر گھی جیسی جنس میسر آتی۔ پھر اماں اور ابا کے دانت کہاں جو گیہوں کی روٹی چبا سکیں۔ ہر دن بیسنی روٹی پسند اور ناپسند کے دائرے میں نہیں آتی...... بلکہ یہ تو مجبوری ہے...... اور...... مجبوری بندہ کا مقدر اور مختاری تو اللہ ہی کو حاصل ہے۔ اماں ابا کے ساتھ کھانا نہیں کھاتی چوں کہ ابا کھانے میں کھانستے زیادہ ہیں۔ اماں کو کراہیت ہوتی ہے۔ ہاں مجھ اور خود سے پہلے کھانا اور ناشتہ ابا کو پہلے سجاتی۔ یہ اس کی شوہر پرستی کی دلیل ہے بھلے ہی شوہر پسندی نہ ہو چوں کہ جوان بیٹے کے سامنے باپ دوئم درجہ کی چیز ہو جاتی ہے۔

''کھا بیٹا...... روٹی ٹھنڈی ہو جائے گی۔''

''ہاں......'' اس نے آدھی روٹی کھا کر چائے پی لی۔

اماں خاموشی سے گردن جھکائے سوچ رہی ہے۔ عبدالحنان کو یہ کیا ہو گیا ہے کہ کم بولتا ہے، اگر اس کے ابا بولیں تو بھی مختصر جواب پھر خاموشی۔ میں بولوں ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ اور ''ہاں ہوں'' مختصر جواب کے بعد خاموشی۔ اس قدر خاموشی سے گھر میں قبرستان جیسی خاموشی چھائی رہتی ہے۔ رات رات بھر جاگتا رہتا ہے، جانے کیا کیا سوچتا ہے؟ وہ سمجھتا ہے اماں سوتی ہے لیکن اماں کروٹیں بدلتی ہے۔ اس کے ابا کو بھی یہ معلوم ہے کہتے ہیں ''اب ہمارا بیٹا بہت کم بولتا ہے پہلے ٹکر ٹکر بولتا تھا۔ جب ٹوکا جاتا تھا تب ہی خاموش ہوتا تھا...'' میں نے بوڑھی ہو کر ڈیڑھ روٹی کھائی اور وہ آدھی روٹی کھا کر دستر خوان سے اُٹھ گیا۔ مجھے اپنے بڑھاپے پر غیرت آئی کہ وہ جوانی میں کم کھاتا ہے...... میں نے اپنی اس تشویش کا اظہار اس کے ابا سے کیا۔ انھوں نے کہا تمہیں بات کرنا مجھے ٹھسکا آتا ہے، بات کرنے میں دقّت ہوتی ہے۔

اترتی سردی کی کھلتی ہوئی رات ہے۔ آسمان پر مسکراتے ہوئے ستارے رقص و سرود میں مست ہیں... خنک ہوا، سبک خرامی سے موسم کی خوش گواری میں اضافہ کر رہی ہے۔ آنگن میں بچھی چارپائی پر چت لیٹا عبدالحنان جھلملاتے آسمان کو آنکھوں میں سمیٹنے کی کوشش میں مگن ہے۔

''بیٹا۔''

''جی اماں۔''

''میرا بڑھاپا ہے...... اب کھانا مجھ سے بنتا نہیں ہے، ایک بہو لے آ۔''

اس کا چہرہ فق پڑ گیا...... کچھ بات نہیں بنی...... منمنا کر رہ گیا اور ہونقوں کی طرح ماں کو دیکھنے لگا۔

''میرے کام میں ہاتھ بٹائے گی...... گھر میں رونق آجائے گی۔''

''اس عمر میں تم اتنا کام کرتی ہو۔ مجھے احساس ہے...... مگر ماں میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا...... (چند لمحے توقف کے بعد) عبدالمنان کی کر دو۔''

''وہ ابھی چھوٹا ہے...... پھر یوں تھوڑی ہوتا ہے کہ چھوٹا بھائی کی شادی ہو جائے اور بڑا بیٹھا رہے۔''

اس طرح کی ٹوکا ٹاکی کرنا اماں کا معمول بن گیا تھا۔ وہ سوچتا ہے ادھر تو اماں کا بڑھاپا اوپر سے بے حد کمزوری...... ابا کی حالت بھی قابلِ رحم ہے...... اپنی بیماری کی وجہ سے اماں کی مدد بھی نہیں کر پاتے...... سانس ان کو چین نہیں لینے دیتی۔ سانس کا ہونا، سانس کا لینا، زندگی کی علامت ہے...... لیکن ابا کے لیے موت کی علامت بن گیا ہے...... لے۔ کن...... لیکن موت تو حقیقت ہے،

مالکِ حقیقی سے ملاقات کرنے کا ایک سفر......اور سفر انسان کی تقدیر ہے...... کائنات میں آنا، کائنات سے جانا...... ایک مقام سے دوسرے مقام تک کا سفر......تلاش، جستجو، آرزو سب ہی سفر ہی کے دوسرے نام ہیں......اور ایک رات کے آخری حصہ میں وہ ایک سفر میں نامعلوم منزل کی تلاش میں نکل پڑا...... چلتے چلتے چاروں طرف اندھیرے میں گونجتی ہوئی...... چُر، چُر ...... پھٹ پھٹ...... ٹِک ٹِک......کی آوازوں کے درمیان سے چپکے چپکے صبح بتدریج نمودار ہوئی...... جنگل کے بیچ سے گزرتی ہوئی پگڈنڈی کے دونوں اطراف اُگے گھنے درختوں کے، چھن چھن کر آتی ہوئی سورج کی کرنوں سے کبھی کبھی آنکھیں چکا چوند ہو جاتیں...... پرندوں کے چہچہانے کی سریلی سُر تال اس کے کانوں میں رس سا گھول رہی ہیں۔ ان کے رسیلے گیتوں میں تقدیس وتہلیل کی خوشبو سے اس کا ذہن معطر ہو رہا ہے۔ وہ دل ہی دل میں انسان کی ناشکری پر اظہارِ تاسّف کرتا ہے کہ رب العالمین کی توصیف بیان کرنے اور ثنا خوانی کرنے میں لاپرواہی برتتا ہے۔

چلتے چلتے شہر سے بہت دور نکل آیا ہے۔ دھوپ چاروں اطراف پھیل چکی ہے۔ پگڈنڈی سے جڑی ہوئی کالی سڑک کے دونوں اطراف لق دق میدان میں دور دور اکّا دُکّا شیشم کے درخت نظر آتے ہیں۔ ایک پُلیا جس کے نیچے سے چوڑی نالی نکل رہی ہے، جو‘ن کی گرمی سے سوکھ چکی ہے۔ سرخ مٹی کی چٹختی ہوئی پپڑیاں پانی کی جگہ جم گئی ہیں۔ برسات میں نالا بھر کر چلتا ہے تو راہ گیروں کے لیے یہ پُلیا بڑی کار آمد ثابت ہوتی ہے......لیکن زیادہ بارش ہونے سے پانی اس کے اوپر بہنے لگتا ہے اور دور دور تک سڑک بھی پانی کے نیچے غائب ہو جاتی ہے۔ وہ تھکا ماندہ اس پُلیا پر سر جھکائے بیٹھ گیا۔ اچانک کوئی سایہ اس کے اوپر آ کر گرا، کانوں میں آہٹ سی ہوئی اس نے چونک کر دیکھا کہ وہی باریش بزرگ سامنے کھڑے ہیں۔

’’یا ارحم الراحمین کی ذات اقدس سے مایوس ہونا کفر ہے۔‘‘

’’جی...... بزرگ‘‘ اس نے چونک کر کہا۔

’’خداوند تعالیٰ اس کو دوست رکھتا ہے، جس میں دریا جیسی سخاوت، آفتاب کی سی شفقت اور زمین کے مانند ضیافت ہو۔‘‘

’’جی......‘‘ وہ نیچی نگاہ کیے باادب کھڑا رہا۔

’’فکر و عمل کے درمیان فاصلہ توڑنا ہے۔ عیب اپنے، نیکی دوسری کی دیکھنا ہے۔ نفس موٹا ہوتا ہے تو روح کمزور ہوتی ہے۔ سامنے کی حقیقت بھی خلاف شریعت ہو قبول نہ ہوگی۔ خارقِ عادت شے شریعت کی استقامت پر گواہ نہ ہو تو وہ مکر وفریب ہوگا۔ ظاہری طہارت بغیر باطنی طہارت کے منافقت ہے۔‘‘

’’بزرگ میرے سینہ میں آگ سی جلتی ہے لیکن میرے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے......آنکھوں کو کچھ سجھائی نہیں دیتا۔‘‘ اس نے اپنی افسردگی کا اظہار کیا۔

’’اس آگ کو بجھنے نہیں دینا......اسی کی روشنی میں صراطِ مستقیم تلاش کرو۔‘‘ بزرگ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

ایک روشنی کی لکیر اس کے جسم میں سرایت کر گئی...... اس کے سحر اور سرور میں وہ ڈوب گیا جب آنکھ کھلی سامنے سے بزرگ غائب ہو گئے۔

گرمی سخت ہے، تپش کی شدت سے پسینہ میں شرابور وہ جانبِ منزل گامزن ہے۔ نئی توانائی کے ساتھ نہ تکان، نہ تھکن بس لگن اور جب لگاؤ ہوتا ہے تو کانٹے دار کمبل کی طرح دھوپ بھی مخملی چادر میں بدل جاتی ہے۔ وہ تیز قدموں سے سڑک پر چل رہا ہے، سامنے سے لال مٹی کی آندھی تیز رفتاری سے اس کے اوپر سخت دباؤ بنا رہی ہے۔ اس میں دھکا سا لگتا، کپڑوں کو سمیٹتا ہوا سنسان راستے سے گزر رہا ہے...... دائیں ہاتھ پر قبرستان میں ہُو کا سا عالم ہے۔

اس کے آخری سرے پر پیاؤ کے برابر سے پہاڑ کی اونچائی کے لیے ایک چوڑا راستہ لال پتھروں سے پختہ کردیا گیا ہے۔ چوٹی پر شاہ ابدال بابا جو پہاڑ بابا کے نام سے مشہور ہیں، کے مزار شریف پر زائرین کی بھیڑ جمعرات کی فاتحہ خوانی کے لیے جمع ہے۔ باہر دروازے سے پانچ گز دور پیاؤ کے قریب وضوخانہ پر لوگ ٹھنڈا پانی پی رہے ہیں، وضو کر رہے ہیں اور ایک دوسرے کے پیچھے قطار میں کھڑے ہوجاتے ہیں۔ مزار کے اندر داخل ہونے کے لیے تین فٹ چوڑا اور پانچ فٹ اونچا دروازہ ہے۔ لوگ دروازے سے جُھک کر نکلتے ہیں کہ کہیں ماتھا دہلیز سے نہ ٹکرا جائے۔ آنکھوں کے سامنے پہاڑ والے بابا کا مزار شریف ہے۔ بھیڑ جب کم ہوئی وہ بھی پوری احتیاط سے اندر داخل ہوا ''السلام علیکم یا اہلِ القبور'' منھ ہی منھ میں کہا۔ اور شیشم کے درخت کے نیچے کھڑے ہوکر خاموشی سے نظارہ دیکھنے لگا۔ عصر و مغرب کے درمیان چڑھتا سورج مغرب میں اُتر رہا ہے، اس کے چاروں طرف خون کی سرخی پھیل رہی ہے......

عورتیں اور مرد ایک پلیٹ میں گلاب اور گیندے کی پنکھڑیاں ایک ہاتھ میں بتاشوں کی پڑیا لیے سر جھکائے مزار شریف جا رہے ہیں۔ سیڑھیوں پر ماتھا ٹیکتے، مزار کے گرد چکر لگاتے۔ مجاور جو مزار کے قریب ستون سے کمر لگائے بیٹھا پھولوں کی پلیٹ اور بتاشوں کی تھیلی ہاتھ میں لیتا اور ایک کنسٹر میں ڈال لیتا۔ ہر شخص فاتحہ خوانی کر کے بڑے احترام سے مزار کی جانب چہرا کیے، کمر کی طرف سے سیڑھیوں سے اُتر جاتا۔ اگربتی اور لوبان کا دھواں مزار کے چاروں طرف پھیل رہا ہے، مجاور مور پنکھ جھاڑو زائرین کے چہروں پر مارتا۔ کبھی کبھی مزار شریف کے اوپر بڑے احترام سے لہراتا، ''آگے بڑھو......جلدی کرو کی آواز'' لگاتا......تھوڑی دیر بعد مجمع ہلکا ہوگیا۔ مجاور بتاشے اور پھولوں کی ڈلیا لے کر چلا گیا۔ مزار کی سلطنت میں سناٹے کی حکومت قائم ہوگئی...... اللہ ہُو، اللہ ہُو کی آوازوں سے سناٹا سحر انگیز ہو رہا ہے۔ پُراسرار ماحول چاروں طرف طاری ہے۔ وہ ابھی تک گھنے درخت کی شاخ پکڑے خاموش کھڑا ہے۔ سامنے سبز لباس میں ملبوس شیخ ''خانقاہ تمہاری کائنات ہے اس کے باہر جھانکا تو بھٹک جاؤ گے'' کو دیکھ کر چونک گیا......شیخ نے بنا بولے اس کا بایاں ہاتھ اپنے داہنے ہاتھ میں لیا اور بایاں ہاتھ پشت پر رکھے۔ دھیرے دھیرے قدم دائیں جانب شانِ بے نیازی سے آگے بڑھائے اور ایک حجرے میں داخل ہوتے ہوئے ''دنیا سے دشمنی گوشہ نشینی، مردم بے زاری، قربتِ الٰہی کے لیے ضروری ہے'' سرگوشی کی۔

حجرے کا منظر پُراسرار سناٹے میں ڈوبا ہوا ہے۔ پکی چھت کے نیچے چار ستونوں کے نیچے مریدین درجہ بندی کے لحاظ سے دنیا مافیہا سے بے خبر اپنے اپنے ''مرحلہ'' میں غرق آنکھیں بند کیے ہیں۔ اوّل ستون سے کمر لگائے ''ذکر بالجہر'' قلب کی جانب ضرب کے ساتھ جاری ہے۔

''قلب پر ضرب لگاتے ہوئے پوری قوت لگانی چاہیے تاکہ قلب اس کا اثر محسوس کرے اور ذہن کو یکسوئی حاصل ہو۔ یہاں ایسا عالم محسوس ہو کہ جہاں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی چیز نہ مطلوب ہے، نہ محبوب، شیخ نے آہستہ سے کہا۔

اس کی نگاہ دوسرے ستون کی جانب گئی۔

شیخ نے کہا ''ذکرِ خفی۔ پہلے مرحلہ میں عشقِ الٰہی کی آگ دل میں بھڑک اُٹھے گی...... یہاں زبان خاموش ہوجائے گی۔ دنیا سے کلیتاً بے رغبت ہوکر صرف اللہ تعالیٰ کی ذات میں مستغرق ہوجائے گا۔''

اس نے دیکھا سالک پر محویت کا عالم طاری ہے۔

''یہ مقام فنا کی ابتدا ہے جیسے جیسے سالک مراقبے میں پیش رفت کرے گا کیفیت کا اعلیٰ مقام حاصل کرے گا۔'' شیخ گویا ہوئے۔

اس کی حیران اور ششدر نگاہ تیسرے ستون پر گئی ایک مرید کائنات اور کائنات کی ہر شے سے بے خبر ہوش وادراک سے دور، آنکھیں بند کیے مراقبہ کی حالت میں ہے۔

''یہ سُکر کی کیفیت......سوائے خدا کے کچھ نظر نہیں آتا'' اشارتاً شیخ نے کہا۔

وہ نہایت سنجیدگی سے جذب و کیف کے عالم کو دیکھ رہا ہے......اس کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب گئیں، تھوڑی ہی دیر میں زار وقطار آنسو بہنے لگے۔

بزرگ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا......

''خاموش رہنا، غم و اندوہ میں ہونا، ایک راستہ ہے سلوک کا۔ سالک کی آخری منزل حالتِ صحو ہے یہاں وہ محسوس کرتا ہے کہ ہر عمل اللہ تعالیٰ کے قبضے میں ہے۔ حق تعالیٰ ہی اپنی قوت و جبروت سے اس کو بھی بخشتا ہے۔''

یہ کہہ کر شیخ مراقبہ میں چلے گئے۔ حجرہ میں خاموشی چھا گئی فقط اللہ ہُو کا منظر طاری ہوگیا۔ چاروں طرف روشنی کی لکیریں تانے بانے کی مانند بُن گئیں۔

وہ سلوک کے پہلے مرحلہ کے لیے ذکر بالجہر میں شب و روز پوری ترتیب اور ضابطہ کے ساتھ مشغول ہوگیا۔ دو مہینہ کے عرصہ میں روزانہ چار ہزار ورود کے بعد ذہن اللہ تعالیٰ پر مرکوز ہوا اور عشقِ الٰہی کی آگ دل میں بھڑک اُٹھی۔ اس کمال کے حاصل ہوجانے پر ذکرِ خفی ''اللہ سمیع''، ''اللہ بصیر'' اور ''اللہ علیم'' الفاظ کو عرشِ الٰہی سے کھینچ کر دماغ میں، پھر قلب اور پھر ناف میں، ذکر نفی و اثبات کے ساتھ کیا۔ زبان خاموش ہوگئی لوگوں سے میل جول ترک، دنیا سے بے رغبت ہوکر صرف اللہ تعالیٰ کی ذات میں مستغرق ہونے پر اس نے اپنے کو فانی محسوس کیا، اسے لگا راکھ کے ڈھیر کو ہوائیں اڑائے دے رہی ہیں، کائنات کی ہر چیز پارہ پارہ ہوگئی ہیں، صرف حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات موجود ہے......کائنات کی ہر شے فانی باقی ذات صرف اللہ کی۔ سلوک کی دوسری منزل میں کثرت کے تمام جلوے یک لخت مٹ گئے، عقل کھوگئی، حیران و پریشان، کائنات کی کسی چیز کا ہوش نہیں رہا اور نہ اپنی ذات کا۔ اس کو سوائے خدا کے کچھ نظر نہیں آتا......اس پر سُکر کی کیفیت طاری ہوگئی۔ جب سُکر سے اصل حالت کی طرف واپس ہوا تو اس نے خدا اور بندے کے درمیان فرق کی طرف مراجعت کی، اسے محسوس ہوا کہ جیسے کوئی پہاڑ کے اوپر چڑھ کر نیچے گر پڑے۔

اب وہ حالتِ صحو میں آ گیا ہے، اس نے محسوس کیا کہ اس کا ہر عمل اللہ تعالیٰ کے قبضے میں ہے۔ حق تعالیٰ ہی قوت عطا کرتا ہے اور وہی اس کے تمام افعال واحوال کو اپنے علم اور ارادے کے مطابق وجود عطا کرتا ہے۔

جب وہ اسرارِ الٰہی کا راز دار اور انوار الٰہی سے منور ہوا، شیخ نے خصوصی نظر کرم کی۔ اس کا دائیں ہاتھ پکڑ کر اوپر کی طرف اُٹھایا اور آسمان کی طرف اشارہ کیا ''کیا دیکھتا ہے؟''

''اب تو یہ عالم ہے کہ عرش اور حجاب عظمت تک کی چیزیں پوشیدہ نہیں ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے آنکھوں کے سامنے کوئی پردہ ہی نہیں۔'' اس نے محویت کے عالم میں کہا۔

شیخ نے سبز رنگ کا لباس پہنوایا، خرقہ خلافت سے سرفراز کیا۔ ''اس شخص کو جوانی میں مقتدایان کامل کا مقام بلند حاصل ہوگیا۔''

حلقہ میں بیٹھے تمام مریدین کے چہروں پر خفگی کے آثار نمایاں ہوگئے۔

''خلافت کا عمر سے کوئی تعلق نہیں، یہ سعادت، ریاضت اور عبادت سے ملتی ہے۔'' شیخ نے کہا۔

فوراً سمع کی محفل کا اہتمام ہوا۔ حمد اور نعت کی گونج میں ماحول ڈوب گیا۔ خوش گلو شخص کی پُر درد اور پُرسوز آواز سے ''حال'' کی کیفیت طاری ہوگئی۔

چند لمحے بعد، چنگ و رباب اور مردنگ کی تھاپ پر جب قوالیوں کا دورشروع ہوا تو وہ چونک کر بیدار ہو گیا۔ اچانک اس کے منھ سے نکلا ''سماع میں ذوق، دردِ دل اور سوزِ قلب سے ہوتا ہے، نہ کہ مزامیر سے۔'' نظر اُٹھائی دیکھا شیخ غیر حاضر تھے۔

اس نے مریدوں سے کہا ''خلافِ شرع ہے'' کہہ کر اُٹھ گیا......اور مزار شریف سے باہر نکل کر قصد سفر کیا اور جنگل کی جانب چل دیا۔

سڑک درمیان میں پل صراط کی طرح پڑی ہے، بائیں جانب چٹیل میدان پر آگ برس رہی ہے، سورج سوا نیزے پر اُتر آیا ہے اور سرخ مٹی شعلے اُگل رہی ہے۔ چاروں طرف مٹی کے غبار مٹی کی طرح اڑتا ہوا محسوس کر رہا ہے۔ دائیں جانب طویل القامت درخت صف باندھے کھڑے ہیں۔ پستہ قد رکوع میں جھکے ہیں، خنک ہوا شانِ بے نیازی سے پیرومرشد کی طرح چل رہی ہے۔ اسے کاروبارِ زندگی سے کوئی مطلب نہیں، نہ دنیا سے کچھ لینا دینا۔ فقط نیک چلنی سے چلنا ہے کبھی شدہ شدہ روی سے کبھی تیز قدموں سے۔ چھوٹے چھوٹے پودے ہوا کے دباؤ سے سر بہ سجود ہیں۔ برگ و بار جھوم جھوم کر درود و سلام پڑھ رہے ہیں۔ ایک عجیب و غریب کیف و سرور کا منظر ہے۔ اس نے نظر اُٹھائی، دور پہاڑ کی اودی چوٹی پر نیلی چادر کی اونچائی کوہساروں کی تنی ہوئی گردن کا غرور چکنا چوُر کر رہی ہے۔ عرش بریں کے سامنے آسمان گردن جھکائے دست بستہ کھڑا ہے۔ درختوں کے درمیان ایک خانقاہ کے پیچھے وسیع و عریض نہر دیکھی جس میں اشیا کی صورتیں سایوں کی طرح نظر آ رہی ہیں اور اس میں نئی نئی موجیں اُٹھ اُٹھ کر انوارِ الٰہی کے نغمے گنگنا رہی ہیں۔ اس نے خوش نما منظر کا خوب لطف اُٹھایا۔ جب اس پر سحر اور سرور کی کیفیت طاری ہوئی، سامنے باریش بزرگ اپنی خانقاہ میں مراقبہ کی حالت میں ہیں وہ دوزانو، ذرا فاصلے پر بیٹھ گیا۔ جب باریش بزرگ بیدار ہوئے ان کی نظر کیمیا اثر اس پر پڑی اور یوں مخاطب ہوئے۔

''عقل مند کون ہے؟'' بزرگ نے پوچھا۔

''دنیا کو ترک کرنے والا۔''

''بزرگ کون ہے؟''

''جو کسی چیز سے متغیر نہ ہو۔''

''دولت مند کون ہے؟''

''قناعت کرنے والا۔''

''محتاج کون ہے؟''

''قناعت نہ کرنے والا۔''

''اس کائنات کو بے ثبات جان، جان کو بے جان، حیات عارضی، ذاتِ الٰہی باقی ہے۔'' اس نے خاموشی سے گردن ہلائی۔

''تارک الدنیا ہونا، رہبانیت اختیار کرنا، دوسرے ادیان کی پیروی ہے ورنہ اسی دنیا میں تقویٰ کے ساتھ رہ کر دنیا سے بے رغبت رہنا اصل صوفی کا مسلک ہے۔

''جی۔''

''حیات و کائنات، تہذیب و تمدن، آفتاب و مہتاب، ستارے و سیارے سب ابتدا کی طرف واپس ہو رہے ہیں۔''

''ابھی دو دن ہی گزرے ہیں کہ روحانی لذت و حلاوت دل و دماغ پر چھا گئی ہے۔'' اس نے بزرگ سے کہا۔

''جنگل میں رہنے کے بجائے مخلوق خدا کے درمیان میں رہ۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تجھے نیک بخت بنائے۔ انشاءاللہ تم ایسا درخت ہوگے جس کے سایہ میں مخلوق خدا آرام پائے گی اور فیض پائے گی۔ تم مجاہدہ برابر کرتے رہنا، اس سے غافل نہ ہونا۔'' باریش بزرگ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس نے گھر کی واپسی کے لیے قصد سفر باندھا۔ نئی صبح کا سورج اندھیرے کی چادر پھاڑ کر طلوع ہو رہا ہے اور سارا منظر انوارِ الٰہی میں ڈوب رہا ہے۔

OOO

افسانہ

محبوب پاشاہ اعظمی

تین بڈھوں کو یہ کیا سوجھی!

موبائیل پر روز بیسیوں ایس ایم ایس(SMS) آتے رہتے ہیں مگر کچھ SMS سیکس (Sex) کو یکسپولائٹ(Exploit) کرنے کی غرض سے کیے جا رہے ہیں۔ میرے موبائیل پر جو SMS آئے ہیں کچھ ایسے ہیں:

آپ کے لیے میرا دل دھڑکتا ہے میں کون ہوں جاننے کے لیے اس نمبر پر کال کریں۔

My heart beats for you. To know who am I call me on.................

دوسرا ایک SMS ہے۔

آپ کی تنہائی ختم کرنے اور نئی دوستی کا جشن منانے کے لیے اس نمبر پر...... کیوں کہ اکیلے آپ نہیں دونوں چاٹ کریں بے انتہا لطف اٹھائیں۔

Lets destroy you loneliness and celebrate a new friendship on (Phone No.) because alone you can say but together we can chat. Have unlimited fun.

اور تیسرا

ہیلو! میں آنا یکا ہوں، بوریت ہو رہی ہے؟ صرف میرے ساتھ چاٹ کریں اور سب کچھ بھول جائیں۔ مجھے آپ کا انتظار ہے اسی وقت کال کریں اس ٹال فری نمبر پر.........

Hellow! ANAIKA here feeling bored? Just chat with me and forget every thing. I am waiting......... call me at (Phone No.) Toll free now

یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ آخر یہ سب کیوں ہو رہا ہے۔ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ اس طرح کے SMS سے نوجوان نسل پر کیا اثر پڑتا ہے اسی طرح سوچتے ہوئے میں نے اپنے دوست پانڈے کو کال کی۔

ہیلو! پانڈے..... کی کررہے ہو!

''جھک مار رہا ہوں'' پانڈے غصہ میں ہوتا ہے تو ایسے الفاظ اس کی زبان پر خود بخود آجاتے ہیں۔

''پانڈے کام کی بات ہے''۔ میں اپنے مدعا پر آنا چاہتا تھا۔

ہاں کہو! کیوں یاد کیا؟

''آپ ہمیں بھلا بیٹھے ہو، ہم تو آپ کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ پانڈے جی''

نہیں یہ بات نہیں.... آپ کی بھابی اپنے میکے گئی ہوئی ہے اس لیے کچھ زیادہ مصروف ہوں۔ کہو! کس لیے فون کیا؟

''پانڈے یہ موبائیل پر ایسے ایسے SMS آرہے ہیں اللہ کی پناہ!''

''کس قسم کے SMS پانڈے نے میری بات پوری ہونے نہیں دی اور بول پڑا۔ جو SMS میرے موبائیل پر آئے تھے ان کے بارے میں بتانے لگا تو پانڈے نے کہا'' ایسے SMS تو آج کل کامن ہوگئے ہیں۔

لیکن ان کی حقیقت کیا ہے؟

کوئی حقیقت نہیں.....ویسے بھی SMS پڑھتا کون ہے؟ بغیر پڑھے ہی ڈیلیٹ(Delete) کردیئے جاتے ہیں۔

لیکن پانڈے کوئی تو پڑھتا ہوگا۔

مطلب ہمارے جیسے ریٹائرڈ لوگ جن کو کچھ کام نہیں۔SMS پڑھ کر وقت گذارتے تو ہوں گے۔ وقت جو کٹ جاتا ہے اور ایسے SMS کو کوئی Response کرنا چاہیے تو....؟

تمہارا مطلب! تم SMS کا جواب دینے کا ارادہ رکھتے ہو۔نہیں اب اس عمر میں ایسا کرنا گناہ ہے! اگر دل میں حسرت ہے پوری کرو۔SMS کا جواب دو، دیکھو پھر کیا تماشا ہے۔ میں نے پانڈے کی بات ان سنی کردی۔ پھر تو کیا کرنا چاہتے ہو؟ پانڈے پوچھنے لگا!

SMS کا جواب دوں یا نہ دوں، سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ میں نے اپنا ارادہ پانڈے کو بتایا تو وہ کہنے لگا۔ پھر ڈر کیوں رہے ہو؟ میں تمھارے ساتھ ہوں، ہم دونوں اپنے اپنے موبائیل سے SMS کا جواب دیتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کیا Response ملتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے، میں پانڈے کی بات مان لیتا ہوں اور آگے کیا پلان ہے پانڈے سے پوچھتا ہوں، پانڈے بتاتا ہے Reply جو بھی ہو ہم اس کو فالو (Follow) کریں گے۔ پانڈے کی بات مجھے پسند آئی۔اس لیے میں نے ہامی بھرلی۔

پہلا SMS تھا''آپ کے لیے میرا دل دھڑکتا ہے۔میں کون ہوں یہ جاننے کے لیے کال کریں، اس نمبر پر....!'' اس نمبر پر میں کال کرتا ہوں۔ جواب ملتا ہے''آپ کے response کا شکریہ! آپ اب اس نمبر پر کال کریں۔''جب میں نے بتائے ہوئے نمبر پر کال کی۔ایک نسوانی آواز پوچھ رہی تھی آپ کتنے سال کے ہیں''جب میں نے کہا میں 70 سال کا ہوں تو جواب ملا۔ رانگ نمبر (Wrong Number) اور Connection کٹ گیا۔

کچھ دیر بعد پانڈے کا فون آیا، پوچھ رہا تھا کیا ہوا۔ جو ہوا میں سب پانڈے کو بتایا تو پانڈے سے ہنستے ہوئے کہنے لگا:

پاشا صاحب آپ کو اپنی صحیح عمر نہیں بتانی تھی۔ کہتے 30-25 سال کا ہوں تھوڑا جھوٹ بولتے۔

جو ہے میں نے بتا دیا تھا۔ اب تم یہ بتاؤ تم نے ٹرائی (Try) کیا؟ میرے پوچھنے پر پانڈے کہنے لگا۔''نہیں.....اب ٹرائی کرتا ہوں۔گھنٹہ بعد تمہیں کال کرکے بتاتا ہوں کیا ہوا۔

ایک گھنٹہ سے زیادہ ہوا، پانڈے کی کوئی کال نہیں آئی ۔میں نے خود کال کی تو اس کا موبائیل Engage بتا رہا تھا۔ دو گھنٹے ہوئے تھے پانڈے کی کال آئی۔اس نے بتایا''میں نے آپ کی تنہائی ختم کرنے اور نئی دوستی کا جشن والی SMS کو Reply کیا تو جواب ملا''وقت ہے، فری ہو تو مارینا بیچ کے قریب میں جو اسٹار ریسٹورنٹ ہے وہاں آجاؤ۔تمہیں وہاں پر ایک خوب صورت لڑکی سیاہ لباس میں ہوگی اور اس کے ہاتھ میں آج کا اخبار ہوگا اور اس کے کاندھے پر بالکل سرخ رنگ کا بڑا سا ہانڈ بیگ ہوگا۔اس سے ملو۔یاد رکھیں آپ اپنے پرس میں دس ہزار رکھنا نہ بھولیں''۔

پھر......پانڈے تم مارینا بیچ پہنچے، کیا وہاں سے کال کر رہے ہو؟ میرا اضطراب بڑھنا لازمی تھا۔ پانڈے کے ساتھ جو ہوا، یا ہو رہا ہے سب جاننے کے لیے میں بے چین ہوگیا۔

لیکن.....پانڈے بتانے لگا''دس ہزار روپے سن کر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور مرینا بیچ نہیں گیا۔میرے موبائیل پر کال پر کال آرہی ہے''۔ پانڈے کی بات سن کر مجھے لگا، گاہکوں کو پھانسنے کے لیے یہ جسم فروشوں کا ایک نیا طریقہ ہے اور موبائیل ایک Pimp ایک دلال کا کام کر رہا ہے۔

پانڈے کہہ رہا تھا ہم دونوں فلاپ ہو گئے۔

دونوںSMSہمارے فیل ہوگئے۔

اب تیسراSMSیعنی''ہیلو! میں آنیکا..... بوریت ہو رہی ہے؟ کی باری تھی اس SMS کو اس خطرناکSMS کو کون اٹینڈ (Attend) کرے؟ پانڈے کہنے لگا۔ یار یہ تیسرا والا تو بڑاChallenging ہے۔ کیوں نا ہم دونوں ہی try کرتے ہیں۔

''ہیلو! آنیکا'' SMS کو ہم دونوں نے ایک ساتھ reply کیا تو فوراً جواب آیا''کہاں ملنا؟ وقت اور جگہ آپ طے کرکے جوابSMS کرو''۔

ہم دونوں کو اک جیسا جواب ملا تھا۔ ہم دونوں کوDecide کرنا تھا آگے کیا کرنا ہے! اس سلسلے کو جاری رکھنا ہے یا یہیں ختم پانڈے کہنے لگا''یا شاہمت ہے میدان میں اترنے کی؟

ہمت ہے۔ رسک بھی کچھ زیادہ ہے۔

ہاں رسک تو ہے! کیوں نا، بات یہیں ختم کرتے ہیں!! نہیں ;.....جب اتنی دور نکل چلے ہیں اب رُکنا یا پیچھے مڑنا بزدلی ہوگی!

پھر کیا کی جائے، کیوں نا ہمارے دوسرے ساتھیوں سے پوچھ لیں۔ اس گیم کے بارے میں بتادیں!

کون ساتھی؟ میں پانڈے سے پوچھنے لگا۔

ارمان صاحب ہیں، قریش ہے اور موہن لال ہے!''

پانڈے ان میں کوئی کام کا نہیں ہے سب ڈرپوک، کوئی جوکھم نہیں لیتے، جہاں رسک ہو دور ہی رہتے ہیں''۔ میں کہنے لگا، پانڈے کوئی اور نام تمہارے ذہن میں ہے تو بتاؤ۔ کوئی ڈیرنگ باز کا نام.....؟ آپ کے سالے صاحب شرما جی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے میں پانڈے سے پوچھتا ہوں۔

ہاں ہے تو بہادر، رسک بھی لے..... مگر..... ایسا کام کرنے وہ تیار ہوگا مجھےdoubt ہے۔ پانڈے کہنے لگا۔

کوئی بات نہیں؟ پوچھ کے تو دیکھو!

نہ بابا نہ..... یہ گیم آپ کو جاری رکھنا ہے تو آپ ہی شرما کوcontact کرنا ہوگا اور شروع سے آخر تک پوری بات اسے بتاو گے! میں نے ایسا ہی کیا...... پانڈے کی بات مان لی اور شرما کو سب بتایا تو وہ ہنس پڑا، کہنے لگا۔''اس عمر میں تم دونوں کو یہ کیا سوجھی۔ سب خیریت تو ہے؟

سب ٹھیک ٹھک ہے، بس یوں ہی موڈ بن گیا ہے اس طرح کےSMS آخر ہوتے کیا ہیں؟ ان کی تہہ تک پہنچنے کے لیے یہ سب کرنا پڑا ..... تمھاراco-operation ہوتو......

میرے سے کیا expect کرتے ہو؟ میری بات پوری نہیں ہوئی شرما کہنے لگا، کوئی زیادہ بڑی expectation مت رکھنا! ہاں میں تمھارے اس game میں تم دونوں کے ساتھ ہوں، شرما کہنے لگا مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں۔ سارا ملک اس حادثے کا شکار ہے۔ کم عمر90-80 سالہ بڈھے اس بیماری۔ موبائیل بیماری کا شکار ہیں۔ اس بیماری نے اس ساری دنیا کو بیمار کررکھا ہے۔ ایسی صورت حال ہے تو طرح طرح کے بھیانک خطرناکSMS وجود میں آرہے ہیں جوSex کو Exploit کررہے ہیں۔ نوجوان نسل کو گمراہ کردیا ہے۔ نوجوان نسل اس کیaddict ہوگئی ہے۔

شرما ایک ایک سلجھا ہوا دماغ رکھتا ہے اور ایسا شخص رسک ضرور لے سکتا ہے۔ اس لیے میں شرما سے کہنے لگا''آخر کیا decide کیا آپ نے اس event کو جاری رکھیں یاgoodbye.........!

نہیں the end تک لے جاتے ہیں، شرما نے میری بات کاٹ دی۔

تو ہوجائے!

ہوجائے!! میں نے''آنیکا.... والے SMS کو شرما

کے موبائیل نمبر پر فارورڈ کیا۔

شرما نے یہ SMS ملتے ہی فوراً Reply دیا، کچھ سیکنڈ میں شرما کے موبائیل پر مسیج Message آیا مسیج کیا ہے شرما؟ میں نے شرما کو کال کی تو شرما مسیج پڑھنے لگا۔

Thanks for calling مجھے تین راستہ جنکشن پر جو پہلی بلڈنگ ہے نیلو اپارٹمنٹ، اس کے گراونڈ ground فلور پر ملو، میں jeans پہنی ہوں گی اور اس پر ریڈ کلر ٹی شرٹ ہوگا اور میری آنکھو پر کالا چشمہ! ملنے پر تم decide کرنا کہاں لے چلنا ہے''۔

شرما کا پڑھا ہوا مسیج سن کر میں فوراً کہنے لگا! ''شرما! پانڈے کو اس میسج کی اطلاع دے دو۔ وہ بھی تمھارے مسیج کا انتظار کر رہا ہے!'' یہ سن کر شرما نے بتایا''۔ پانڈے اس کے پاس پہنچ گیا ہے اور کہہ رہا ہے پاشا کو بھی یہیں بلالو۔'' اس لیے آپ فوراً میرے فلیٹ پر آجاؤ۔ تینوں مل کر decide کرتے ہیں۔ مشورہ کرتے ہیں آگے کی کیا رن نیتی ہے۔

جب میں شرما کے فلیٹ پہنچا تو دونوں ہنسی مذاق میں لگے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر شرما کہنے لگا۔ • پاشا جی اچھا ٹائم پاس ہو رہا ہے اور میں اپنے کو 25-20 سالہ نوجوان محسوس کر رہا ہوں۔

ہاں، اس بازی کے تم ہیرو ہو۔ بتاؤ آگے کیا کرنا ہے؟

پانڈے فوراً بول پڑا...... ''مسیج میں روپیوں وغیرہ کی بات تو نہیں تھی؟''

''نہیں! شرما کہنے لگا'' بس اتنا بتایا ہے نیلو بلڈنگ کی گراونڈ فلور پر وہ انتظار کر رہی ہوگی..... ملاقات کے بعد کیا کرنا ہے مجھ پر چھوڑ دیا ہے!''

شرما..... تم اکیلے جاؤ گے؟ یا ہم دونوں تمھارے ساتھ چلیں! میں شرما سے پوچھنے لگا۔ شرما کہنے لگا..... ''تم دونوں میرے ساتھ رہو ایسے کہ اس لڑکی کو محسوس ہو کہ میں اکیلا آیا ہوں''

یہ طے ہونے کے بعد شرما نے اپنی کار نکالی اور ہم تینوں اس میں سوار تین راستہ جنکشن کی طرف روانہ ہوئے۔

کار پارک کرنے کے بعد طے یہ پایا کہ شرما نیلو بلڈنگ اکیلا جائے گا اور ہم دونوں کار میں ہی بیٹھے رہیں گے!

نیلو بلڈنگ کے گراونڈ فلور پر شرما پہنچتا ہے، وہاں ایک لڑکی jeans اور، ریڈ ٹی شرٹ میں دکھائی ہے...... شرما کو اپنے پاس آتا دیکھ کر وہ مسکراتی آگے بڑھتی ہے..... اچانک...... شرما کو کیا ہوا؟ وہ یک دم سے وہاں سے بھاگ کر ہمارے پاس آجاتا ہے اور کار کا دروازہ کھول لینے پر وہ کار کے اندر ہمارے پاس بیٹھ جاتا ہے..... اس کی سانس پھولی ہوئی ہے جیسے وہ کوئی بھیانک حادثے سے بچ نکلا ہو۔

کیا ہوا......؟ خیریت تو ہے؟؟ ہم دونوں شرما کی یہ حالت دیکھ کر پوچھنے لگتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو کنٹرول کرنے کے بعد کہنے لگا...... ''سب فراڈ ہے، وہ لڑکی نہیں....... ہیجڑا ہے''

ہم تینوں ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوجاتے ہیں!

OOO

قلم کاروں سے التماس

☆ برائے کرم مسودہ صاف اور خوش خط لکھیں۔
☆ مقالہ صفحے کی ایک جانب لکھا ہوا ہو۔
☆ سطروں کے درمیان فاصلہ چھوڑیں۔
☆ کمپوز کیے ہوئے مسودہ کا پروف اچھی طرح دیکھ لیں۔
☆ اپنے مضامین اور تخلیقات

idarasabras@yahoo.in پر بھیج سکتے ہیں۔

خاکہ

قمر جمالی

کیسے راوی داستاں کی داستاں کھا جائے مگر: آہ راشد بھائی

۵/اکتوبر کی صبح اخبار دیکھا تو.........

ع دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں

کے مصداق کچھ ٹھنڈی نرم اور کچھ تیز ابی یادوں سے دل میں ایک دھندسی اٹھی اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ اخبار میں جناب راشد آزر کے انتقال پر ملال کی خبر چھپی تھی۔ یادوں کا ایک ہجوم تھا جو امڈا چلا آ رہا تھا۔ یہ یادیں ہمارے اندر 38 سالوں سے ذخیرہ تھیں اور کبھی اس کی نکاسی کی ہم نے ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ راشد بھائی سے ہمارا تعارف اس وقت ہوا جب ہم نے اپنے شوہر محترم جناب محمود حامد کے ساتھ 1979ء میں ''انجمن ترقی پسند مصنفین'' کی باضابطہ رکنیت حاصل کی۔ خوش قسمتی سے اسی سال ہمیں انجمن کی مجلس عاملہ کی رکنیت بھی مل گئی۔ بوٹا سا قد، سرخ و سفید بے داغ رنگ، پینتالیس اپچاس کا سن، سر پر کم کم بال، سفید کرتا پاجامہ، پاؤں میں چڑھاوے اور موسم کے لحاظ سے کندھے پر شال اوڑھے جب وہ ساڑھے چھ بجے انجمن کے جلسہ گاہ میں آتے تو لوگ اپنی گھڑیوں کی طرف دیکھنے لگتے۔ چہرے پر سنجیدگی کے ساتھ متانت، ہونٹوں پر محبتوں کی رمق، نرم آواز، انداز تخاطب ایسا کہ سامنے والا خو کو برگزیدہ محسوس کرے۔ ایک دم صاف شفاف اور نہایت ہی شستہ اور شائستہ لہجہ، جب تک وہ بات کرتے رہیں سامنے والا خواہ کسی عمر کا ہو وہ محسوس کرتا۔

"I am feeling elivated"

نفاست کا یہ عالم کہ اوپر اوڑھی ہوئی شال پر بھی معمولی سی سلوٹ گوارہ نہیں۔

ہم نے جب انجمن ترقی پسند مصنفین میں داخلہ لیا اس وقت جناب راشد آزر صدر تھے۔ (ترقی پسندوں کی روایت رہی ہے کہ انجمن کا جلسہ چاہے کتنا ہی بڑا ہو صدارت انجمن کے صدر کی ہی ہوتی ہاں معتبر مہمانان کی حیثیت مہمانان خصوصی کی ہوتی خواہ وہ کسی بھی پوزیشن کے ہوں اور جلسے کی کاروائی جنرل سکریٹری ہی چلاتا ہے) اس وقت انجمن نہایت سنجیدہ اور ثقہ قسم کے ادیبوں، دانشوروں اور شاعروں (مرد و خواتین) کا گہوارہ تھی ہندی اور تلگو کے بھی ادیب پابندی سے شرکت کرتے تھے جن میں جناب ششی نرائن سوادھین اور جناب ایس وی ستیہ نارائن (موجودہ وی۔سی، تلگو یونیورسٹی) بھی شامل ہیں۔ چوں کہ انجمن P.W.A. کا ایک طرح سے کمیونسٹ پارٹی سے الحاق رہا اس لیے ثقہ قسم کے اصول پرست کمیونسٹ انجمن کے رکن رہے جو موسم کی سردی گرمی کی پروا کیے بغیر جلسوں میں شرکت کرتے۔

اس زمانے میں انجمن کے جلسے ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ، عابد روڈ میں ہوا کرتے تھے۔ ہال سامعین سے کھچا کھچ بھر جاتا اور لوگ دو دو گھنٹے کو ریڈور میں کھڑے ہو کر سماعت کرتے۔ وقت کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ ساڑھے چھ بجے کا مطلب چھ بج کر تیس منٹ ہوتا اکتیس نہیں خواہ سامعین میں صرف ایک ہی سامع کیوں نہ ہو (جو کبھی نہیں ہوتا، لوگ وقت سے پہلے نشستوں پر جم جاتے) انجمن اپنے Scheduled Bye Laws کی سختی سے پابندی کرتی۔ کسی رکن کی مسلسل غیر حاضری کا سخت نوٹ لیا جاتا۔ غیر جانبدارانہ انداز میں اس سے استفسار کیا جاتا اور پابندی لاگو کی جاتی۔ نہ ماننے کی صورت میں خارج تسلیم کیا جاتا۔ انجمن کو مجمع لگانے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ ایسے شرکاء جن میں سیکھنے اور اکتساب

علم کا شوق نہیں ہوتا انھیں Mob تصور کیا جاتا۔ کیوں کہ انجمن اپنے ارکان کی ذہنی تربیت میں نہایت سخت تھی۔ زبان کی چھوٹی سے چھوٹی لغزش کو برداشت نہیں کیا جاتا بلکہ سرزنش کی جاتی۔ بالخصوص راشد آزر کو لفظوں کا پارکھ کہا جائے تو حق بجانب ہوگا۔لفظوں کے لغوی اور مراوی معنوں کے ساتھ ساتھ ان کا محل، ان کا وقوع، جملوں کی دل پذیری، دل آویزگی، بیانیہ اسلوب، لفظوں کا آہنگ سمعی حسن، لفظوں کی ضیاء باری اور گرانی، عبارت میں حشو وزواید سے اس کا بوجھل پن قرأت کے حسن میں آہنگ کے سقم سے در آنے والے عیوب تلفظ کی صحت اور ادائیگی.... غرض کوئی ایسا نکتہ نہ ہوتا جس پر توجہ نہ دی جاتی۔ خاکسار کو اس معاملے میں اپنی قسمت پر رشک ہوتا ہے کہ اس کی ذہنی تربیت ایسے لوگوں کے بیچ ہوئی۔ محاورے، استعارات، تشبیہات اور تراکیب راشد کی شناخت ہیں۔ انھیں محاوروں میں ذرا بھی توڑ پھوڑ پسند نہیں تھی۔ اسی تربیت کا نتیجہ ہے کہ راقمۃ الحروف کو بھی محاوروں کو مسخ کر کے استعمال کرنا قطعی گوارہ نہیں۔ راشد آزر کو تراکیب کی بڑی سوجھ بوجھ تھی اگر کوئی دو زبانوں کے لفظوں کو جوڑ کر تراکیب بنالے تو وہ سخت غصہ ہو جاتے مثلاً لبِ سڑک، کہتے لب، فارسی ہے اور سڑک، اردو یہ ترکیب غلط ہے۔ قارئین کو لگ رہا ہوگا کہ بات تو راشد آزر کی ہو رہی تھی پھر یہ انجمن ترقی پسند مصنفین کہاں سے ٹپک پڑی۔ حق بات یہ ہے کہ جناب راشد آزر تمام عمر ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے اور ایک سچے کمیونسٹ کی زندگی جی۔ انھیں خود کو لامذہب کہتے کوئی تردد نہیں ہوتا تھا کیوں کہ یہ بانگ دہل خود کو کمیونسٹ کہتے تھے۔ لہٰذا جب عصمت چغتائی کی ان ہی کی وصیت کے مطابق دفنایا نہیں گیا بلکہ سپرد آگ کیا گیا تو لوگوں نے سخت سست کہنا شروع کیا اس وقت راشد آزر نے سخت مخالفت کی کہ آگ میں جلائے جانے سے ان کی ادبی حیثیت متاثر نہیں ہوتی۔

راشد بھائی ایک کٹر قسم کے اصول پرست انسان تھے۔ کہتے تھے اصول انسانوں کی فلاح کے لیے مرتب کیے گئے ہیں اور جب کوئی انسان اپنے اصولوں پر عمل آوری کے لیے کوئی راستہ چن لیتا ہے تو اسے اس پر قائم رہنا چاہیے۔ ایک بار انھوں نے کہا تھا۔

''میں نے اپنی ماں معصومہ بیگم کے خلاف ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کے لیے انتخابی مہم چلائی تھی کیوں کہ میں کمیونسٹ پارٹی کا حامی تھا''۔

مگر.......

یہی اصول پرستی زندگی کے آخری ایّام میں ان کی تنہائی کا باعث بن گئی۔ 1995ء کی ترقی پسند مصنفین کی پچیسویں کانفرنس کے حیدرآباد میں انعقاد کے بعد وہ کچھ معاملوں میں اراکین انجمن سے متنفر ہو گئے اور علیحدگی اختیار کر لی۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ وہ تقریباً گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ مگر قلم سے ان کا رشتہ ہمیشہ استوار رہا۔ راقم الحروف سے جو رشتہ روزِ اول قائم ہوا وہ باقی رہا۔ اکثر فون پر یا کبھی کبھی بالمشافہ ملاقاتیں رہیں مگر وہ پہلی جیسی بات باقی نہ رہی۔ پہلے دل کا عارضہ ہوا سرجری ہوئی کمزور ہو گئے اور باہر نکلنا بند کر دیا۔ گاڑی خود چلانے سے احتیاط کرنے لگے۔ کہیں آنا جانا تقریباً ختم کر دیا۔

مگر.........

قلم سے ان کا رشتہ محبوبانہ رہا وہ بھی ایسی محبوبہ جن سے نظر بھر کی دوری بھی انہیں گوارہ نہ تھی۔ ۱۳ر اگست ۱۹۳۱ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ راشد آزر کو اس شہر سے والہانہ عشق تھا۔ اگر چہ کہ انھیں امریکہ میں مستقل سکونت پذیر ہونے کے پورے مواقع تھے مگر انھوں نے اپنے وطن مولود جوان کا وطنِ مالوف بھی تھا کو چھوڑ نا گوارہ نہ کیا۔ وہ اکثر کہا کرتے......

''جس وقت میری شریک حیات فاطمہ اس دنیا سے
گزری میری عمر صرف چالیس سال تھی''۔

مردوں کے لیے یہ عمر تو شباب ہی کی عمر ہوئی۔ ایسے راشد آزر نے نہایت مدبرانہ انداز میں بلکہ شاہانہ طریقے سے تنہا رہنے کو ترجیح دی۔ اپنی بیوی فاطمہ کا ذکر لوگوں کے سامنے بہت کم کیا کرتے مگر جب بھی کرتے ان کے چہرے پر حزن وملال کے آثار ہویدا نہیں ہوتے بلکہ ایسا نور بکھر جاتا جس سے سامنے والے کو لگتا کہ وہ ان لطیف لمحوں کو اب بھی جی رہے ہوں۔ وہ درحقیقت فاطمہ بی بی کے ساتھ گزری رفاقتوں کے سچے امین تھے جن میں دخل اندازی کی ذرا سی بھی گنجائش نہیں تھی۔ ہجر کی کربنا کیوں اور تنہائی کی ہولنا کیوں کو انھوں نے اپنی شاعری میں ایسے جذب کیا کہ قاری کے لیے ہجر کی بیتابی اور رفاقتوں کی طمانیت کے درمیان لکیر کھینچنا ناممکن ہوگیا۔

راشد کے شعری مجموعہ ''آبدیدہ''، میں شاذ تمکنت رقم طراز ہیں، ''آزر پر فاطمہ کی وفات کا اس قدر شدید اثر ہے کہ اس کی نظمیں جن کا بنیادی خیال براہِ راست اس غم کا مظہر نہیں ہے، ان میں بھی تشبیہات موت کے تصور کو جگا دیتی ہیں''۔

دوڑ کر فون کے آلے کو اٹھا لیتا ہوں
کوئی آواز نہیں صرف وہی کھر کھر ہے
گو رکن جیسے کسی قبر میں مٹی کھینچے
وقت کی قبر میں ہم دفن ہو خوشیوں کی طرح
(نظم ''واہمہ'' سے)

ہر ترقی پسند شاعر کی طرح جناب راشد آزر بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ مگر انھوں نے غزلیں بھی اسی شانِ تمکنت سے کہیں جس کی وہ حقدار ہیں۔

ان کے ورثے میں تقریباً درجن بھر شعری ونثری تصانیف شامل ہیں جن میں ''اندوختہ''، ''جمع وخرچ وفا''، ''آبدیدہ''، وغیرہ شامل ہیں۔ راشد آزر ایک کہنہ مشق شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں لفظوں کا رچاؤ کچھ ایسا ہوتا کہ قرأت ازخود لَے میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ اکثر کہتے:

''لفظوں کو عبارت میں ایسے بساؤ کہ وہ نگینے لگیں نہ کہ
زبردستی ٹھونس دیئے گئے ہوں''۔

باوجود اس کے کہ ان کا شعری رویہ بڑا اپختہ تھا ان کی شعری جمالیات کے تقاضے بالکل مختلف تھے۔ مثلاً ان کے اظہار میں معصومیت کی للک، اظہار میں عشق کی وارفتگی اور برتاؤ میں ہجر کی بے چینی، لیکن ان سب میں ایسا تناسب کہ شاعری میں سنجیدہ فضا بن جاتی تھی اور ایسا ایسا رکھ رکھاؤ تھا کہ باوجود ہجر کی تلخیوں کے قاری انھیں رومانی فضا سے الگ نہیں کرسکتا تھا۔

رباعی کو مشکل صنف مانتے تھے۔ امجد کے بعد کسی کی رباعیوں کو درخور اعتناء نہیں سمجھتے تھے۔ کہتے تھے کہ رباعی کہنا ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس فن پر دسترس حاصل کرنے کے لیے ایک عمر درکار ہے۔ واقعی جب انھوں نے رباعیاں کہنی شروع کیں تو راشد آزر کی ادبی عمر چالیس سال سے تجاوز کرچکی تھی۔ ''منزل شوق'' راشد آزر کی (۲۰۰) رباعیوں کا مجموعہ ہے 1992ء میں منظر پر آیا۔ گو کہ رباعی کے مضامین میں عارفانہ اور صوفیانہ مسائل باندھے جاتے ہیں جن میں خلاقانہ نصیحت آمیزی بھی ہوتی ہے۔ مگر راشد آزر نے اپنی رباعیوں میں عشق اور حسن وجمال کی تصویر کشی کی ہے ان کے حسن پرست ہونے کی بڑی دلیل ہے اور یہ رنگ سخن انھیں فراق سے قریب کرتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

زلفیں ہیں کہ بادل ہے گھنیرا جیسے
چہرہ ہے کہ سورج کا بسیرا جیسے
پلکوں کی گھنی جھاڑیاں ہیں جلوہ فگن

آنکھیں ہیں کہ جنگل میں سویرا جیسے

راشد آزر میرؔ کی شاعری سے بے حد متاثر تھے۔ ان کی تصنیف ’’میر کی غزل گوئی.... ایک مطالعہ‘ ان کی تنقیدی بصیرتوں کی غماز ہے۔ اس کتاب کے لکھنے کے دوران انھوں نے میرؔ کے کچھ ایسے اشعار جمع کیے جو ان کے دیوان میں شامل نہیں ہیں اور جو میر کو ان کی شہرت اور پہچان کے برخلاف انہیں رومانی شاعر ثابت کر سکتے ہیں۔ ان اشعار کے ذریعہ راشد آزر یہ ثابت کرنے کی فکر میں رہے کہ میرؔ نے بھی اوروں کی طرح جسم و جان کی شاعری کی۔ یہیں سے راشد آزر کے شعری لب و لہجہ میں ہجر کے ساتھ وصل کی لذت اور محبت کی سرشاری شامل ہوئی اور آخری دور کی شاعری میں میرؔ کا رنگ واضح نظر آتا ہے۔ بالخصوص میرؔ کی معصومیت راشد آزر کا پسندیدہ موضوع رہا۔

خود میرؔ کے مطابق.......

نازک مزاج آپ قیامت ہیں میرؔ جی

جیوں شیشہ میرے منہ نہ لگو میں نشے میں ہوں

راشد آزر بھی کچھ اتنے ہی نازک مزاج تھے۔ اچھے شعر پر مکمل داد دیتے خواہ وہ کسی مبتدی کا ہی کیوں نہ ہو۔ اور اگر شعر انہیں جما نہیں فرتوت، کہہ کر رد کر دیتے۔ اپنی زندگی میں اعتدال پسندی کو اپنا شعار تو بنایا حتی کہ مے نوشی میں بھی اعتدال پسند رہے مگر ان کی نازک مزاجی اور سخت ترین اصول پرستی نے انھیں بالکل اکیلا کر دیا۔ وہ تنہائی کا شکار ہوئے اور خانہ نشین ہو گئے۔ ۱۴ر اکتوبر کی اولین ساعتوں میں اس دارِ فانی سے کوچ کیا اور مقبرہ فخر الملک عماد الدولہ میں پیوندِ خاک ہوئے۔

آخری بار اپنی کلیات نقش وفا، کی اجراء پر اپنے ہی جلسے میں شرکت کی۔ اس کے بعد انھیں کہیں کسی محفل میں کسی نے نہیں دیکھا۔

راشد آزر منفرد لب و لہجے کے معتبر شاعر ہیں۔ زبان کی صفائی، فنی رچاؤ، دلکش تشبیہات اور استعارات، چست بندش اور نت نئی تراکیب ان کی شاعری کی جان ہیں۔ راشد آزر اردو شاعری کا ایک ایسا معتبر نام ہے جسے قاری کبھی فراموش نہیں کر سکے گا اور تاریخ کے اوراق میں محفوظ رہے گا۔

ہم سنہرے لفظ ہیں تاریخ کے اوراق ہیں

کیسے راوی داستاں کی داستاں کھا جائے گا

000

ماہ نامہ ’سب رس‘ انٹرنٹ پر

www.sherosokhan.com

برقی کتاب کلک کرنے پر دیکھا جاسکتا ہے۔

قمر جمالی

کا

ناول

آتش دان

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس۔ دہلی

علی احمد فاطمی/شمس الہدیٰ دریابادی

نقد و نظر

ف۔س۔اعجاز کے مضامین ''ارتکاز''

مبصر: علی احمد فاطمی

ف۔س۔اعجاز ایک ممتاز و معروف شاعر، ادیب،افسانہ نویس،صحافی اور تنقید نگار ہیں۔انہوں نے ترجمے بھی کئے ہیں اور سفرنامے بھی لکھے ہیں۔ایک عرصۂ دراز سے انشاء جیسا اہم رسالہ پابندی سے شائع کر رہے ہیں۔مفکر اور دانشور ہیں اسی لیے تنقید و تحقیق سے بھی شغف رکھتے ہیں۔ 2002 میں ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''موقف'' ان کی تنقیدی ژرف نگاہی کا ثبوت پیش کر چکا ہے۔ چودہ سال کے بعد اب ان کا دوسرا تنقیدی مجموعہ بعنوان ''ارتکاز'' منظرِ عام پر آیا ہے جس میں پچیس مضامین ہیں۔ یہ مضامین محض مضامین نہیں ہیں بلکہ ان میں فکر ہے، خیال ہے اور ایک نظریہ بھی۔پیش لفظ میں وہ صاف طور پر لکھتے ہیں ۔

''مضامینِ محض کا انبار لگانے کے حق میں خود کو نہیں پاتا۔مصنف کا اپنا نقطۂ نظر جن سے واضح نہ ہو ایسے مضامین میرے نزدیک ثانوی حیثیت رکھتے ہیں''۔

ان جملوں سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ اعجاز جو کچھ لکھتے ہیں ان میں ایک جذبہ ہی نہیں نظریہ بھی ہے۔ آپ اس سے اختلاف تو کر سکتے ہیں لیکن اس کی سنجیدگی اور متانت سے انکار نہیں کر سکتے۔

ان مضامین میں جو مجھے متاثر اور متوجہ کر سکے ان میں انتظار حسین کے افسانے،فراق کی نظمیہ شاعری،کلامِ فیض کے چند افادی پہلو، غالب پر نارنگ کی تنقید،کبیر داس،قمر رئیس کی لکھائی کے پچاس سال،عصمت چغتائی کے ذہنی رویئے وغیرہ۔ کچھ تبصرے ہیں جنہیں بطور مضمون شامل کر لیا گیا ہے۔ کچھ صحافتی نوعیت کے مضامین جن کی اپنی الگ اہمیت ہے۔

انتظار حسین کے افسانے کی تمہید ظاہر کرتی چلتی ہے کہ یہ کسی پروفیسنل نقاد کی تنقید نہیں ہے۔انتظار حسین کی تفہیم کے لیے یہ تمہید ضروری بھی تھی۔اس کے بعد افسانوی پس منظر لیکن اس سے زیادہ اہم انتظار حسین کی وہ تحریریں جو انہوں نے اپنی فکر اور اپنے افسانوں کے بارے میں لکھی ہیں،جنہیں اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ خاص طور پر علامت، استعارہ اور ساطیر کے بارے میں مصنف کی رائے کہ یہی انتظار حسین کے اجزائے اعظم ہیں۔

مضمون میں انتظار حسین کے تصورِ تخلیق پر عمدہ گفتگو کی گئی ہے جو قابلِ مطالعہ ہے اس کے بعد ان کے تخلیقی ادب کی جانچ پڑتال ہے،کئی افسانوں کے تجزیے ہیں لیکن بحیثیت مجموعی رائے کا اظہار کم ہوا ہے۔مضمون کے آخر میں افسانہ ''دوسرا راستہ'' کا ذکر ملتا ہے اور اس جملہ پر مضمون ختم ہوتا ہے ۔

''آج بھی جس معاشرے کا یہ افسانہ ہے وہاں سوار اور اونٹ دونوں سوئے ہوئے اور نیند میں چلتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ انتظار حسین کی گڑھی ہوئی صلاحتوں کی خیر ہو!''(ص ۲۳)

ان جملوں میں اردو کی روایتی تنقید کا سامراج نہیں ملتا بلکہ صحافت کا دخل ملتا ہے لیکن تجزیے کا حق تو ادا ہوتا ہے کہ تنقید یک رخے انداز میں لکیر پیٹنے کا نام نہیں۔اس طرح کے تنقیدی اشارے تو حسن عسکری کے یہاں بھی مل جاتے ہیں۔

اس کتاب دوسرا مصرکہ کا مضمون فراق کی نظموں سے متعلق ہے۔فراق غزل کے شاعر تھے اس لیے ان کی غزلوں پر گفتگو تو

خوب کی گئی لیکن نظمیں عدم توجہ کا شکار ہوئیں۔ اعجاز نے نہ صرف نظموں کا بھرپور تجزیہ کی ہے بلکہ اس تہذیبی پس منظر کا ذکر خوب خوب کیا ہے جو قرآن کی نظمیہ شاعری میں بطور خاص جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ یہ جملے دیکھیے۔

''فراق شاعر ہی نہیں ایک زیرک نقاد بھی تھے۔ ان کی شاعرانہ بصیرت مختلف علوم سے تیار ہوئی تھی۔ نہ صرف عالمی ادب پر ان کی گہری نظر تھی بلکہ تاریخ انسانی اور مذاہب عالم کا بھی انہیں شعور تھا۔ شاعری کے لیے اُن کے پاس اپنا جواز، اپنی فکر اور اپنے فیصلے تھے''۔

اعجاز صاحب نے ایک نکتہ اور نکالا کہ جو عورت پریم چند کے افسانوں میں نظر آتی ہے کم و بیش ہندوستان کی وہی عورت فراق کی شاعری خاص طور پر رباعیوں میں ملتی ہے پورے پھیلاؤ کے ساتھ اور ساتھ میں یہ بھی کہا —— ''جبکہ انہوں نے بدترین ناکام ازدواجی زندگی گذاری''۔ اس کے بعد کا تجزیہ بھرپور ہے کہ مایوسی اور محرومی ایک شاعر کے ذہن میں کس طرح طلب اور تڑپ کا تصور بنتی ہے اور پھر وہ تصور تخلیقی وجدان کا حصہ بن کر پیمانہ شعر میں ڈھلتا ہے۔ اس کے بعد جگنو، ہنڈولہ، جُدائی، جھلکیاں وغیرہ کا ذکر ملتا ہے جس میں اصل فراق کو تلاش کیا گیا ہے جس کی معراج ہے نظم ''آدھی رات'' جس کو مصنف نے اردو کی بہترین نظموں میں شمار کیا ہے۔ اور یہ بالکل سچ ہے فراق کی نظم ''آدھی رات'' اپنی امیجری، ہندوستانی تہذیب، زمینی استعاروں وغیرہ کی وجہ سے غیر معمولی نظم ہے۔ ان کا صرف ایک مصرعہ ''کنول کی چٹکیوں میں بند ہے ندی کا سہاگ'' فراق کی غیر معمولی صناعی اور تہذیبی جلوہ گری کا بہترین نمونہ پیش کرتا ہے۔ ف۔س۔ اعجاز نے اس نظم کا عمدہ تجزیہ پیش کیا ہے اور سمجھ بوجھ کر پیش کیا ہے۔ فراق اگر صرف نظمیں ہی کہتے تو بھی ان کے بڑے شاعر ہونے میں شبہہ نہ ہوتا۔ بلاشبہ یہ مضمون اس کتاب ''ارتکاز'' کا ایک اہم مضمون ہے۔

اب میں کچھ اہم مضامین کے بعض ٹکڑے پیش کرتا ہوں۔

- ''فن کی ھمیشگی کو کسی سیاسی نظریہ سے مشروط نہیں قرار دینا چاہئے۔ فیض کا نام ان کی پائدار ادبی قدروں کے سبب زندہ رہے گا——''　　　(کلام فیض کے افادی پہلو)
- ''جس طرح ہمیں موجود شئے کی حاضری کا ادراک ہوتا ہے۔ اسی طرح غیر موجود شئے کی غیر حاضری بھی علم کا حصہ بنتی ہے۔ چنانچہ مثبت کے مقابل منفی کی اہمیت ضروری نہیں کہ ماند پڑ جاتے——''

(غالب پر نارنگ کی تنقید)

- ''بہت سے لوگ شاعری کو محض جذبے کا اظہار قرار دیتے ہیں۔ وہ عقلی مواد (Wisdom Content) کو غیر اہم مانتے ہیں۔ یہ ایک بچکانہ نظریہ ہے''۔

(نئی نظموں کا گلزار)

- ''قرآن اور وید کی تعلیمات پر عمل آوری کی راہ میں دونوں مذاہب کے لوگ بہت سی بدعتوں کو اپنے عقیدوں میں شامل کر بیٹھے ہیں جس سے انسان اور خدا کی قدر افزائی ناقدری کا شکار ہو جاتی ہے——''

(کبیر داس)

- ''انسانی وسائل کا فروغ ہر سیاسی جماعت کے پروگرام میں شامل ہے اور یہ پورے ادب کی اجتماعیت کے جگائے ہوئے احساسِ انسانیت کی خاموش دین ہے''۔

(قمر رئیس کی لکھائی کے پچاس سال)

- ''زندگی اور کہانی کے نظریات کو مربوط کرنے والے ناولوں کی شناخت اُن بُحرانوں کے ذریعہ ہوتی ہے جن کے بارے میں وہ لکھے گئے ہوتے ہیں''۔

مثالیں اور بھی ہیں۔ ان مثالوں میں اختلاف کی گنجائش تو نکل سکتی ہے لیکن اس سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ اعجاز صاحب جو بھی لکھتے ہیں سوچ سمجھ کر لکھتے ہیں۔ با قاعدہ ایک رائے ہوتی ہے۔ اس رائے میں اگر چہ کبھی کبھی صحافت بھی بولنے لگتی ہے لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا کہ یہ ایسی کوئی بُری بات نہیں ہے کہ محض کتابوں، حوالوں اور مکتبی رویوں سے پُر تنقید کے مقابلے اس نوع کی تنقید میں کھلا ڈلا رویہ اور نظریہ ہوتا ہے اور پھر تنقید یوں بھی مختلف علوم و افکار کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اسی سے اس کا سیاق بڑا ہوتا ہے آخر میں ایک مختصر سا مضمون عصمت چغتائی کے ذہنی رویے پر ہے۔ یہاں بھی یہ جملہ دیکھئے۔

''فکشن میں انسانی رشتوں کا عمل دیکھنے اور سمجھنے کا ہوتا ہے۔ خون اور خیر خواہی کے رشتوں، محبت اور آرزو اور نفرتوں کے رشتوں کی باریک سوئیوں سے افسانوں کے لانگ پلے (Long Play) ریکارڈ بجتے ہیں''۔

پھر انہیں حوالوں اور سیاق و سباق میں وہ عصمت چغتائی کے ذہنی رویوں کی تلاش کرتے ہیں جو آسان کام نہیں بہر حال کچھ اچھے اشارے ملتے ہیں لیکن یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مضمون کسی سیمینار کے لئے کیا گیا ہے جہاں اختصار لازمی ہوا کرتا ہے۔

نیاز فتح پوری اور قمر رئیس پر لکھے گئے مضامین متوجہ کرتے ہیں اور اس کتاب کی وقعت اور اہمیت میں اضافہ کرتے ہیں۔

ارتکاز معمولی کتابوں کی بھیڑ میں ایک عمدہ کتاب ہے۔ باضابطہ تنقیدی کتابیں ان دنوں کم لکھی جا رہی ہیں۔ تحقیقی مقالے اور شعری مجموعے زیادہ ہیں۔ ایسے میں ایسے سنجیدہ اور قابلِ مطالعہ مضامین کی کتاب کا بہر حال استقبال کرنا چاہئے۔ میں ذاتی طور پر ف۔س۔ اعجاز کو اس کتاب کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

●●

کتاب: ابوالکلام آزاد: بصیرت اور عمل

مصنف : پروفیسر بی شیخ علی   مترجم: پروفیسر ابوالکلام

مبصر: شمس الہدیٰ دریابادی

زیر تبصرہ کتاب ابوالکلام آزاد: بصیرت اور عمل، ہندوستان کے مشہور مورخ تیس سے زائد کتابوں کے مصنف منگلور اور گوا یونیورسٹیوں کے بانی وائس چانسلر ''پروفیسر بی شیخ علی'' کی انگریزی کتاب (مجھے معلوم نہیں کہ انگریزی کتاب کا کیا نام ہے کیونکہ اس ترجمہ شدہ کتاب میں کہیں اس کا تذکرہ نہیں ہے) کا ترجمہ ہے جسے مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کے صدر شعبہ اُردو پروفیسر ابوالکلام نے اُردو میں منتقل کیا ہے، میں اس پس و پیش میں تھا کہ کتاب پر پہلے بات کروں یا ترجمہ اور مترجم کے بارے میں کچھ کہوں مگر مناسب یہ معلوم ہوا کہ موخرالذکر کے سلسلے میں پہلے بات کی جائے کیوں کہ ترجمہ شدہ کتاب کا ہی میں نے مطالعہ کیا ہے، جہاں تک ترجمہ کی بات ہے تو یہ میرا میدان نہیں ہے کہ اس بارے میں اپنی رائے دے سکوں کہ ترجمہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے نیز ترجمہ کے عمل میں کن باتوں کو دھیان میں رکھا جائے۔ ان تمام کو پروفیسر ابوالکلام صاحب سے ہی معلوم کرتے ہیں وہ زیر تبصرہ کتاب میں لکھتے ہیں کہ کسی زبان کے موضوع و مواد کی تفسیر، تعبیر، تجزیہ، تشریح، توضیح، تجدید یا تلخیص وغیرہ بیان کرنا ترجمہ نہیں بلکہ تہذیبی و لسانی سانچے میں پیوست موضوع و مواد کو ان کی ترتیب اور شدت و کیفیت کے ساتھ ہدف زبان کے تہذیبی و لسانی سانچے میں بجنسہٖ منتقل کرنے کے فن و عمل کو ترجمہ کہتے ہیں۔

چونکہ ابوالکلام صاحب لسانیات کے ماہر ہیں اس لئے وہ ترجمہ کی جانے والی کتاب کو لسانیت کی مختلف شاخوں کے توسط سے بغور مطالعہ پر زور دیتے ہیں اس کے بعد اپنی فہم و فراست سے

ان باریکیوں کو جسے مترجم نے صاحبِ تصنیف سے حاصل کیا ہے منتقل کرنا کامیاب ترجمہ کی دلیل بتاتے ہیں، اس لحاظ سے پروفیسر بی شیخ علی کی اس کتاب کا ترجمہ شدہ کتابوں میں کیا مقام ہے، یہ بحث میں ترجمہ کے ماہرین پر چھوڑتا ہوں۔ البتہ مطالعہ کے دوران یہ کتاب مجھے ترجمہ کے بجائے طبع زاد تصنیف کا بار بار احساس دلاتی رہی۔

مترجم کے اطمینان کے لئے قاری کا یہ تاثر یقیناً کافی ہے، پروفیسر ابوالکلام صاحب ایک کامیاب مترجم پہلے ہیں یا بہترین استاد یہ کہنا ذرا مشکل ہے مگر یہ ضرور ہے کہ موصوف ترجمہ کا ایک طویل تجربہ رکھتے ہیں، مختلف علوم وفنون پر انھوں نے متعدد کتابوں کے ترجمے کیے ہیں۔ ہندوستان کے ذولسانی ماہرین کے صفِ اول میں ان کا شمار ہوتا ہے جس کی گواہی میں نہیں بلکہ ان کا کام دے رہا ہے۔

اب میں زیرِ تبصرہ کتاب کی طرف واپس آتا ہوں جو نو (9) ابواب پر مشتمل ہے، پہلا باب ''آباو اجداد اور ابتدائی زندگی'' کے عنوان پر محیط ہے جس میں مولانا آزاد کے خاندان کا مکمل تعارف ہے۔ تعارف کراتے ہوئے پروفیسر بی شیخ علی کا کہنا ہے کہ مولانا آزاد کی رگوں میں ایرانی، عربی اور ہندوستانی لہو رواں تھا۔ خاندان سخت مذہبی تھا اس لئے گھر پر اتالیق رکھ کر صرف روایتی تعلیم دی گئی جسے مولانا نے سولہ سال کی عمر میں مکمل کرلیا۔ سخت نگرانی کی وجہ سے مطالعہ کا شوق بے پناہ پیدا ہوگیا، عربی، فارسی اور اُردو زبانوں پر عبور حاصل کرلیا۔ اس عمر میں امیر مینائی کی اصلاح لے کر شاعری بھی شروع کردی مگر جلد ہی یہ میدان علامہ اقبال کے لئے چھوڑ کر نثر نگاری کا راستہ اپنالیا۔ مطالعہ کی کثرت نے مذہبی توہمات اور رسم ورواج کے خلاف بغاوت پیدا کردی 1902ء سے 1908ء کے دوران وہ لادریت میں ڈوب گئے عقلیت پرستی ان کی عقل پر حاوی رہی مگر بعد میں آزاد نے اسے زندگی کا تاریک ترین دور کہا ہے۔ رفتہ رفتہ ان میں تبدیلی آئی اور ترجمان القرآن کے دیباچہ میں اعتراف کیا کہ کافی عرصہ تک میں مادیت اور سوشلزم کے سراب کو حیاتِ عشق سمجھتا رہا مگر حقیقت مجھ پر آشکارا ہوئی کہ مذہب استدلال اور منطق کا متحمل نہیں بلکہ خالص بے لوث دینداری اور پرہیزگاری کے ذریعہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ قرآن کے پیغام تک وہ پہنچ گئے جو بالآخر الہلال سے لے کر زندگی کے ہر ہر تاریخی موڑ پر اس کی گونج سنائی دیتی ہے۔

باب دوم تشکیلی دور کے عنوان سے 1903 تا 1919 پر مشتمل ہے۔ یہ ذہنی بحران کا دور تھا، بنگالی ہندوؤں میں سماجی و سیاسی انقلاب رونما ہو چکا تھا، مولانا آزاد ان کے رابطہ میں آئے ان کی سیاسی زندگی کا آغاز یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ اس دوران مصر، شام وترکی وغیرہ کا دورہ کر کے وطن لوٹے تو 1912ء میں الہلال کے ذریعہ قرآنی تعلیمات کو مسلمانوں تک پہنچا کر ان کی معاشرتی اصلاح اور سیاسی بیداری کا کام لیا، پروفیسر بی شیخ علی کے مطابق اسی الہلال کے ذریعہ مولانا آزاد نے سرسید کی انگریزوں کے تئیں وفاداریت کی پالیسی کے خلاف مہم جاری رکھی اور ہندو مسلم اتحاد کی وکالت کی ۔ مسلمانوں کو قومی جدوجہد کے قریب کیا یہاں پروفیسر بی شیخ علی نے شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی تحریک ریشمی رومال کو مولانا آزاد سے منسوب کردیا ہے۔ صفحہ 57 پر وہ لکھتے ہیں:

> ''پہلی جنگ عظیم کے دوران جب ہندوستانیوں کی مدد سے عارضی حکومت قائم کی گئی تھی تو اس کا منصوبہ مولانا آزاد نے بنایا تھا ۔ یہ مولانا آزاد ہی تھے جنھوں نے مولانا عبیداللہ سندھی اور دیگر لوگوں کو کابل اور محمود الحسن کو حجاز بھیجا تھا''۔

جدوجہد آزادی کی اتنی بڑی اولین تحریک کو سمجھنے میں پروفیسر بی شیخ علی سے کیسے چوک ہوگئی۔ گاندھی جی اور مولانا آزاد سے بہت پہلے بلکہ انڈین نیشنل کانگریس کے قیام سے قبل ہی 1878ء میں شیخ الہند نے ''ثمرۃ التربیت'' کی بنیاد رکھ کر تحریک آزادی کا آغاز کر دیا تھا۔ 1913ء تک تحریک آخری مرحلہ میں داخل ہوگئی تھی۔ کابل میں عارضی حکومت بنا کر راجہ مہندر پرتاپ کو اس کا صدر بنایا گیا۔ راز فاش ہونے پر انگریزوں نے ہی اس کا نام ریشمی رومال تحریک رکھا۔ شیخ الہند کو حجاز سے گرفتار کر کے مالٹا میں قید کر دیا۔ ''کابل میں سات سال'' مولانا عبیداللہ سندھی کی خودنوشت سوانح ہے اس میں واضح طور پر مولانا سندھی نے لکھا ہے کہ 1915ء میں کابل گیا مگر تفصیلی پروگرام نہیں بتایا گیا وہاں جا کر مجھے معلوم ہوا کہ شیخ الہند جس جماعت کے نمائندہ تھے اس کی پچاس سال کی محنتوں کا حاصل میرے سامنے تعمیل حکم کے لئے تیار تھا۔

تیسرا باب ایام خلافت پر محیط ہے۔ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ تھا جب پورا ملک انگریزوں کے خلاف متحد تھا۔ اس دوران 1923ء میں مولانا آزاد انڈین نیشنل کانگریس کے سب سے کم عمر صدر منتخب ہوئے۔ چوتھے باب میں زمانۂ تعطل: فرقہ وارانہ سیاست کو اجاگر کیا گیا ہے۔ 1923ء سے 1937ء کے درمیانی برسوں میں مولانا آزاد پس پردہ رہ کر کام کرتے رہے فرقہ وارانہ فسادات کا لامتناہی سلسلہ اس وقت جو شروع ہوا تو آج تک جاری ہے۔ مولانا آزاد نے قوم پرستی کا تصور دیا۔ انھیں علی گڑھ مکتبۂ فکر سے اختلاف تھا اور اسلام کو قوم پرستی کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے خبردار بھی کیا کہ ہندو مسلم اتحاد کے بغیر آزادی ایک سراب ہے۔

پانچواں باب اس کتاب کا سب سے اہم باب ہے جس میں 1937ء سے 1947ء کے دوران مولانا آزاد کے حرکیاتی رول پر بحث ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے نتیجہ میں تحریک آزادی بامِ عروج کو پہنچ گئی، اس دوران مسلسل سات برسوں تک مولانا آزاد کانگریس کے صدر رہے، اس طرح ہندوستانی سیاست کی کلید مولانا آزاد کے ہاتھوں میں تھی۔ ان دس برسوں میں کئی سیاسی واقعات رونما ہوئے۔ مثلاً کرپس مشن، ہندوستان چھوڑو تحریک، شملہ کانفرنس، 1946ء کے عام انتخابات، برٹش کیبنٹ مشن پلان، عارضی حکومت دستور ساز اسمبلی کی تشکیل، ماؤنٹ بیٹن پلان اور اقتدار کی حقیقی منتقلی وغیرہ یہ وہ تاریخی واقعات ہیں جس میں مولانا آزاد کا کردار قائدانہ رہا۔ ملک کی آزادی انتہائی قریب تھی کہ مولانا آزاد کانگریس کی صدارت سے دستبردار ہوگئے یہ مولانا کی زبردست بھول تھی۔ بعد میں اس کا احساس انھیں ہوگیا تھا۔ بہر حال اس باب میں ان تمام کا ذکر ہے۔

چھٹا باب مذہبی افکار پر مشتمل ہے۔ مصنف نے مولانا آزاد کے مذہبی خیالات وافکار پر اس باب میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ سرسید اور اقبال سے ان کا موازنہ بھی کیا ہے۔ اسی ضمن میں ترجمان القرآن اور تذکرہ کا مکمل تعارف پیش کیا ہے۔ مولانا آزاد مذاہب کے درمیان اتحاد کے پیروکار تھے۔ اس بنا پر انھیں مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا۔

ساتواں باب صحافتی مہارت عنوان سے موجود ہے۔ مولانا آزاد ابتدائی دور سے ہی صحافت کے پیشہ سے وابستہ رہے ہیں بلکہ انھوں نے اسے مشن کی شکل دی اور آخری سانس تک اسے نبھائے رکھا، مولانا آزاد کن کن اخباروں کے مدیر رہے یا جزوی طور پر وابستہ رہے ان تمام کا تفصیلی ذکر اس باب میں موجود ہے۔ بی شیخ علی صاحب نے یہ ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ مولانا آزاد کی صحافت مسلمانوں میں سماجی تبدیلی لانے میں کامیاب رہی نیز ان کی کاوشوں سے طبقہ اشرافیہ میں قابلِ قدر تبدیلی رونما ہوئی۔

ادبی دائرہ کار عنوان سے آٹھویں باب میں مصنف نے اول مولانا آزاد کے فلسفیانہ ذہن، مذہبی فکر اور نثر کی رنگینی کا ذکر کیا ہے پھر غبارِ خاطر اور انڈیا ونس فریڈم کا تجزیاتی تعارف پیش کیا ہے۔

نواں اور آخری باب یادِ ماضی کا محاسبہ اور شخصی عادات واطوار کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔ جس میں مولانا آزاد کی جہدِ مسلسل والی زندگی اور اس سے متعلق واقعات کا مختصر تعارف کراتے ہوئے ان کے ذاتی خصائل، عادات واطوار، کردار ومعاملات، کمالات، ذاتی پسند و ناپسند پر محتاط طریقے سے روشنی ڈالی ہے۔ 22/فروری 1958ء کو مولانا اس دنیا سے رخصت ہوئے دہلی کی جامع مسجد اور لال قلعہ کے درمیان آپ کی آخری آرام گاہ ہے جو کہ نہایت مناسب جگہ ہے۔ پروفیسر بی شیخ علی رقم طراز ہیں:

> ''یہ مقام ان کی مذہبی اور سیاسی زندگی کے دوحصوں کی نشاندہی کے لئے بالکل موزوں تھا .... خدا کی حمد ایک جانب تو انسان کی صفت گری دوسری جانب، عبدیت ایک جانب تو عارضی شان وشوکت دوسری جانب۔ ایک جانب سے موذن کی اذان سننے کے لیے تو دوسری جانب آزاد ہندوستان کا نقارہ سننے کے لئے''۔(ص34)

کتاب میں کہیں کہیں پروف ریڈنگ کی کمی رہ گئی ہے مثلاً سرورق پر جلی حروف میں مولانا نیشنل اُردو یونیورسٹی لکھا ہوا ہے جب کہ لفظ ''آزاد'' چھوٹ گیا ہے، ایسے ہی ایک جگہ ص 41 پر عبدالرزاق ملیح آبادی کے بجائے عبدالرزاق کانپوری درج ہے۔ ایک بات قابل لحاظ یہ ہے کہ اُردو میں انگریزی اور ہندی کے بعض الفاظ مِن وعَن شامل کر لئے گئے ہیں یہاں مثال پیش کرنے کا موقعہ نہیں ہے البتہ کچھ الفاظ ابھی مستعمل نہیں ہیں ایسے ہی ہندی کا ایک لفظ ''یوگدان'' ہے جو اس کتاب میں صفحہ نمبر 8، 29، 148، 277، اور 292 میں پانچ جگہ آیا ہے۔ میرے خیال میں یہ درست نہیں ہے۔ بہرحال مولانا آزاد پر بڑی تعداد میں کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ اپنی محدود معلومات میں جتنی کتابوں کا میں نے مطالعہ کیا ہے ان میں پروفیسر بی شیخ علی کی یہ کتاب منفرد اور اہمیت کی حامل نظر آتی ہے کیونکہ موصوف نے انتہائی محتاط رویہ اپناتے ہوئے غیر جانبداری سے مولانا کی زندگی کے ہر ہر گوشہ کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے ورنہ اکثر مورخین افراط وتفریط کا شکار ہوجاتے ہیں۔ مجھے قوی امید ہے کہ یہ کتاب ادبی اور تاریخی حلقوں میں پسند کی جائے گی بلکہ پڑھی بھی جائے گی پڑھی اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اب پڑھنے کا رجحان کم ہوتا جارہا ہے۔ پروفیسر ابوالکلام صدر شعبۂ اُردو کو میں مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے اتنی اہم کتاب کو اُردو والوں کے ہاتھوں میں پہنچائی ساتھ ہی مبارکباد دیتا ہوں مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کے اربابِ حل وعقد کو کہ اس کتاب کو شائع کر کے ایک مستحسن قدم اٹھایا۔

OOO

سب رس

ادارۂ ادبیات اردو کا رسالہ ہے۔
جس کو کوئی سرکاری امداد نہیں ملتی
اعزازی کاپی طلب فرما کر ہمیں
شرمندہ نہ کیجیے۔

خطوط

(مراسلہ نگار کے خیالات سے ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے)

جو وہ لکھیں گے جواب میں

مکرمی پروفیسر بیگ احساس صاحب ____ تسلیمات!

خوب صورت منفرد ٹائٹل اور معنی خیز اداریہ ''سب رس'' کی شناخت بن چکے ہیں۔ جس معیار کے تحقیقی مضامین آپ شائع کرتے ہیں کسی اور رسالے کے بس کی بات نہیں ہے۔ مرزا خلیل احمد بیگ کا ''اردو کی کھڑی بولی بنیاد'' بے حد معلوماتی اور معیاری مضمون ہے۔ عبد الصمد کا انٹرویو بہت برجستہ ہے۔ غالبًا ''چہار سو'' سے لیا گیا ہے۔ پاکستانی رسائل سب تک نہیں پہنچتے۔ ''سب رس'' کے ذریعہ ہندوستان، پاکستان اور مغربی ممالک تک پہنچ جائے گا۔ ''یادیں'' اس بار حیدرآبادی پکوان کی تراکیب پر لکھے گئے مضمون میں تبدیل ہوگئیں۔ رانی صاحبہ 2010ء سے اپنی آپ بیتی لکھ رہی ہیں۔ اب اگر لکھنے کو کچھ باقی نہیں رہا ہے تو اس سلسلے کو ختم کر دینا چاہیے۔ اردو میں بہترین خودنوشت سوانح موجود ہیں۔ کوئی اور خودنوشت شائع کیجیے۔ سب رس کا ایک ایک صفحہ قیمتی ہے۔ یہ کام نئے سال کے آغاز سے ہی کر دیں۔ جوش پر خامہ بگوش کا مضمون مزا دے گیا۔ ''جوش کی زبان سے ان کی شاعری جتنی دل کش لگتی تھی، کاغذ پر اتنی دلکش نظر نہیں آتی''، ''جوش کی شاعری سے ان کی نثر بہتر ہے'' جوش اپنی شاعری میں بہت بڑے نقیب انقلاب اور معلم اخلاق نظر آتے ہیں مگر عملی زندگی اس کے برعکس تھی'' خامہ بگوش نے کئی حقیقتوں کا خوب صورت اظہار کیا ہے۔ جوش نے ۷۵ برس کی عمر میں بیس برس کی لڑکی سے بزعم خود معاشقہ کیا۔ ہمارے کئی بڑے ادیبوں کو نوجوان لڑکیوں نے اسی طرح بے وقوف بنایا۔ زندگی کے اسرار کا درک رکھنے والے فن کار جان بوجھ کر بے وقوف بنتے رہے۔ بے چارے راجندر سنگھ بیدی کے ساتھ بھی ہی ہوا۔ اگر آپ نعت چھاپنا ضروری سمجھتے ہیں تو ترتیب میں اسے سب سے پہلے شائع کیجیے۔

علیز احسن۔ سری نگر۔ کشمیر

محترم المقام برادرم بیگ احساس صاحب ____ آداب و نیاز!

آپ نے اپنے اداریئے بلکہ یوں کہیے کہ سیاسی اداریئے میں حالات حاضرہ کا احاطہ کیا ہے جس میں ٹرمپ کے ٹرم کارڈ کی صورت میں چنا جانا اور بساطِ حیات پر کھلے جانے والے عوامی رجحانات کے جوّے سے محمول کیا جا سکتا ہے کیوں کہ لوگوں میں ہر پانچ برس کے بعد منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے عوام بھی عجیب کٹھ پتلی ہے جو کسی ایسے شخص کا انتخاب بڑے ذوق وشوق سے کر لیتی ہے جو موافق رہنمائی کا حامل نہیں ہوتا، باوجود اس کے نو منتخب صدر کے خلاف لاکھ مظاہرے کیے جائیں اور ریلیاں نکالی جائیں۔ ایسی مثالیں اپنے بھارت کے انتخابات میں بھی پیش آئی ہیں جس کا جیتا جاگتا ثبوت ہمارے وزیر اعظم ہیں جنھوں نے اپنی رنگ برنگی حکمرانی کے دوران نت نئے گل کھلائے اور ایسے ایسے شوشے چھوڑے مثلاً مذہب کی تبدیلی، گاؤکشی کی مخالفت، یکساں سیول(Civil) کوڈ کی حمایت، شریعت میں ٹانگ اڑائی اور مسلم پرسنل لا بورڈ میں دخل اندازی کے بعد اب نیا بم اسپورٹ نوٹ بندی کی صورت میں برپا کیا ہے جس کے اچھے نتیجے بہت کم اور اذیت ناک نتائج کا سامنا آج تک عوام کر رہی ہے بقول آپ کے مودی جی نے بیرونی ملک سے کالا دھن ہندوستان لانے اور ہر شخص کے کھاتے میں پندرہ لاکھ روپے جمع کرنے کی بات کی تھی اور اب اس بات کا متضاد پس منظر یہ دیکھنے کو مل رہا ہے کہ ہم اپنے خون پسینے کی کمائی کے پیسے بھی Banks اور (ATM) سے حاصل کرنے میں

قاصر ہیں اور بڑے صبر سے اس ناگہاں صورتِ حال کو جھیل اور پیل رہے ہیں.........

محترم ڈاکٹر خلیق انجم کے انتقال کی خبر ہم سب ادیبوں کے لیے یقیناً صدمہ کن ہے کیوں کہ وہ بڑی پابندی سے ''ہماری زبان'' اور ''اردو ادب'' چھپوا کر ہماری چوکھٹوں تک پہنچاتے رہے ہیں اور ان کی وفات مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں 1962ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا طالب علم تھا تو ''ہماری زبان'' کے مدیر پروفیسر آل احمد سرور تھے اور موصوف ٹامل ناڈو کے ادیبوں اور شاعروں مثلاً مرحوم دانش فرازی، مرحوم کاوش بدری، مرحوم راز امتیاز، مرحوم ایس۔ایم۔حیات، مرحوم عزیز تمنائی اور ڈاکٹر سید صفی اللہ مرحوم کی تخلیقات بڑی فراغ دلی اور وسیع النظری کے ساتھ شائع فرماتے رہے اور اس سلسلہ کو موصوف کے بعد ڈاکٹر خلیق انجم نے مزید توانائی بخشتے ہوئے ٹمل ناڈو کے فن کاروں کی جو بھی تخلیقات ''ہماری زبان'' کے دفتر کو جاتی تھیں وہ صفحہ اول جگہ پاتی تھیں آج دکھ اس بات کا ہے حالیہ مدیر صوبیاتی عصبیت کا شکار نکلے۔خیر یہ تو اپنے اپنے ظرف کی بات ہے۔

حیدرآباد کے سیکولر مزاج شاعر، ادیب او رنقاد راشد آزر کا انتقال پر ملال بھی باعثِ صدمہ کن تھا کہ اچانک شہنشاہ گیت حضرت بیکل اتساہی کا داغ مفارقت دے جانا بھی ناقابل فراموش سانحہ ہے۔

حضرت آغا حیدر حسین، جو دہلی میں پیدا ہوئے اور حیدرآباد میں وفات پائے۔مرحوم نے تادم حیات وہاں رہ کر جو حیدرآباد کی سیر کا نقشہ کھینچا ہے۔شاید ہی کسی ادیب نے ایسی منظر نگاری کی ہے کیوں کہ ہندوستان کے تین ادبی اور تہذیبی مراکز میں ایسے مثالی اور عالم انتخاب شہر واقع ہوئے ہیں جو تہذیبی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہوئے بھی اپنی منفرد مثال رکھتے ہیں جس میں حیدرآباد دکن اپنی مثال آپ ہے یہاں کی تاریخی عمارتیں ادبی اور لسانی رویے، رسم و رواج زندگی کی تمام قدروں کے ساتھ متحرک دکھائی دیتے ہیں۔حالاں کہ وہ گزشتہ حیدرآباد آج ہو بہ ہو دیکھنے کو نہیں ملتا لیکن اس کے تہذیبی، ثقافتی اور لسانی نقوش سالار جنگ میوزیم کے نوادرات میں منور و منقش صورت میں محفوظ ہو گئے ہیں جنہیں دیکھ کر عالمِ تصور میں گزشتہ حیدرآباد عروس البلاد کا دیدار کر لیتے ہیں۔قطب شاہی دور سے لے کر آصف جاہی دور تک حیدرآباد جن جن پہلوؤں اور صورتوں میں آباد و شاداب رہا اس کے آج بھی گولکنڈہ کے کھنڈر، بارہ دری کے سات گنبد، فلک بوس چار مینار قطب شاہی دور کی عظیم الشان مساجد، عاشور خانے، بازاریں اور معظم جاہی مارکٹ تک قلی قطب کی یاد کو تازہ کر دیتی ہیں۔

حضرت شارب ردولوی صاحب نے آغا حیدر حسن مرزا کے شاہ کار مضمون گزشتہ حیدرآباد کو یقیناً اقتباسات کا لبادہ پہنا کر اپنے دیانت دارانہ ادبی فریضہ کا بین ثبوت دیا ہے۔

برادرم محسن جلگانوی نے ڈاکٹر محمد حسن، سرور الہدیٰ، خلیل الرحمٰن اعظمی، زبیر رضوری، مغنی تبسم، ابوالفیض سحر اور علی احمد جلیلی کے بیانات کا سہارا لے کر خورشید احمد جامی کی شعری سلطنت کے نقوش اُجاگر کیے ہیں۔غالباً 1974ء میں ہفت روزہ ''برگِ آوارہ'' میں تمام تر مطبوعہ مضامین جگہ پا چکے ہیں۔گویا موصوف نے اپنے طور پر جامی کی شعری کائنات کی سیر نہیں کی ہے۔

''شاعری شب خون مضمون میں ''خامہ بگوش''، شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقید سے متعلق جو محمد حسن عسکری کا بیان دیا ہے وہ صد فی صد سچائی پر مبنی ہے اور خسروانِ مملکتِ ادب کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ''حالی کے بعد اردو تنقید فاروقی کے ذریعہ ایک نئے معیار سے آشنا ہوئی ہے''۔خیر اجازت چاہوں گا آنکھیں آہستہ آہستہ جلن کی حدوں کو چھونے لگی ہیں۔امید ہے کہ آپ بہ ہمہ وجوہ اچھے

ہوں گے۔ **علیم صبا نویدی۔ چینائی**

مکرمی بیگ احساس صاحب.......السلام علیکم!

آپ کے اداریئے حالات حاضرہ کی ترجمانی بڑے بیبا کانہ انداز میں کرتے ہیں۔آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ہارون شامی صاحب نے نثار جیراج پوری صاحب کی غزل کے قوافی کی گرفت صحیح کی ہے۔لیکن میری نظر میں ان کی غزل کا مطلع محل نظر ہے۔پلکوں کے لیے ٹپکنا آنا چاہیے۔

اور آنکھ کے کٹوروں کے لیے چھلکنا۔مطلع کی صورت یوں ہونی تھی

غم کا پیمانہ ہوں پلکوں سے ٹپکنے دے مجھے

زرد آنکھوں کے کٹوروں سے چھلکنے دے مجھے

اکتوبر کے شمارے میں تمام غزلیں معیاری ہیں غلام مرتضٰی راہی اور شارق عدیل صاحبان کی غزلیں خاص طور سے پسند آئیں۔کہیں کہیں کتابت کی غلطی نے مزہ کرکرا کر دیا۔احمد رشید صاحب چھپے رستم نکلے۔اچھے افسانوں کے

ساتھ اچھی نظمیں بھی لکھتے ہیں۔افسانوں میں سید ظفر ہاشمی صاحب کا ''پھلانگ'' بہت پسند آیا۔ **محمد عابد علی عابد۔علی گڑھ**

محترم جناب بیگ احساس، مدیر ماہنامہ 'سب رس' حیدرآباد

عزیز گرامی!

امید کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔گزشتہ ماہ میں کچھ دنوں کے لیے حیدرآباد میں مقیم رہا۔ادارۂ ادبیات اردو اور 'سب رس' کے احباب سے ملاقات رہی اور آپ کے موقر ماہنامہ 'سب رس' کا تازہ شمارہ بھی دستیاب ہوا۔میں یہاں وضاحت کردوں کہ میرے والد کے تعلقات ادارہ ادبیات اردو سے 1940ء سے 1948ء تک رہے۔میرے مرحوم والد حمید اللہ خاں شیدا نے ضلع پربھنی میں ادبیات اردو کے معتمد کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔اس وقت تک ادبیات اردو کی جانب سے یہاں امتحانات بھی ہوتے رہے۔1944ء میں میرے والد کی محترم بہادر یار جنگ پر پہلی سوانح زیرعنوان ''آفتاب دکن'' حیدرآباد سے شائع ہوئی اس کی کچھ کاپیاں آج بھی حیدرآباد میں مل جاتی ہیں ماہنامہ 'سب رس' سے کافی عرصے سے میرا تعلق ہے۔اب یوں لگا کہ یہ رسالہ حیدرآباد کی ادبی رسائل سے یکسر مختلف انداز لیے ہوئے ہے۔زیر نظر شمارے میں مضامین، افسانے اور غزلوں کے انتخاب اور ترتیب نے رسالے کو وقار اور معیار بخشا ہے۔ان کے علاوہ میری ذاتی رائے یہ کہ ادبی تخلیقات کے علاوہ سماجی علوم پر بھی مضامین ضرور شائع کریں چوں کہ 'سب رس' میں اس سے قبل ان موضوعات پر پروفیسر رشید الدین خاں، پروفیسر حسن عسکری وغیرہ کے اہم مضامین شائع ہوئے ہیں۔مجھے یقین ہے کہ آپ کی کاوشوں سے 'سب رس' مزید نکھرے گا۔میری جانب سے تمام ارباب ادارہ ادبیات اردو کو دلی مبارک باد۔ **اقبال مجید اللہ۔پربھنی**

پروفیسر بیگ احساس صاحب______تسلیم و نیاز!

سال گزشتہ کے دسمبر کا سب رس ملا۔آپ کا اداریہ زمینی حقائق کو واشگاف کر رہا ہے۔نوٹوں کی تنسیخ سے سارے ملک کے طول وارض میں افراتفری پھیل گئی ہے۔بینکوں کا نظام متزلزل ہوگیا ہے۔غریب آدمی، مزدور دہقان لحہ لحہ مر رہا ہے۔اکبرالہ آبادی کے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے۔

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ

رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

مودی جی نے ہندوستان کو پتھر کے پرانے دور میں ڈھکیل دیا ہے۔ جس طرح چائے والا صبح سویرے چائے بیچنے کے لیے سڑک پر

آ جاتا ہے اسی طرح وہ عوام کو صبح ہی سے بینکوں کی لمبی قطاروں میں کھڑے ہونے پر مجبور کر رہے ہیں۔ نفسیاتی طور پر وہ اپنے بھوک و افلاس بھرے زندگی کے ایام کو قوم کے سر پر مسلط کر رہے ہیں۔ ان کی تحلیل نفسی کی جائے تو یہی حقیقت آشکار ہوگی۔ وہ بظاہر پرائم منسٹر ہیں لیکن ان کے اندر ایک بھوکا، بے بس، لاچار، غم روزگار کا ستایا ہوا چائے فروش بسا ہوا ہے۔ اسے نکال پھینکنے میں وہ ناکام ہو چکے ہیں۔ وہ سماج سے اپنے ناآسودہ ماضی کا انتقام لینا چاہتے ہیں۔ ان کی Split Personality ہے۔ ہٹلر، اسٹالن، مسولینی کی بھی منقسم شخصیت تھی۔ اس کا خمیازہ لاکھوں کروڑوں معصوم انسانوں کو دینا پڑا۔ ایسے لوگ کبھی نہیں سدھرتے وہ سمجھتے ہیں کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں ٹھیک کر رہے ہیں۔ وہ لاعلاج ہوتے ہیں۔ وہ مسیحا کو بھی قاتل کہتے ہیں۔ وہ تباہی و بربادی کو تعمیر قرار دیتے ہیں۔ خامہ بگوش کا مضمون جوش اور فتنہ آخرالزماں بعد از مرگ بھی جوش کے ساتھ ناانصافی کر رہا ہے۔ عنوان میں لفظ آخرالزماں غیر ضروری ہے۔ اس کے بجائے دلبراں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ چوں کہ مضمون کا ایک حصہ جوش کے معاشقوں یعنی Love Affairs سے ہے۔ اس مناسبت سے عنوان جوش اور فتنہ دلبراں ہونا چاہیے تھا۔ آخرالزماں ایک عقیدہ ہے۔ پیغمبر اسلام کو آخرالزماں کہا جاتا ہے۔ اثنائے عشری میں بھی حضرت مہدی آخرالزماں کا تصور ہے۔ اس کے ساتھ فتنے کا لفظ استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ فتنہ کا ناد جال کہا جا سکتا ہے۔ فتنہ ارتداد بھی بولا جاسکتا ہے۔

مجھے خامہ بگوش کی سوچ پر ہنسی آرہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جوش صاحب عمر رسیدہ ہوکر کم عمر لڑکی سے محبت کر رہے تھے۔ ارے میرے پیارے خامہ بگوش عشق عمر دیکھ کر نہیں حسن دیکھ کر ہو جاتا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی کم عمر عطیہ فیضی سے محبت کر بیٹھے تھے۔ اقبال جرمنی کے شہر ہائڈل برگ کی کافر حسینہ مس ایما دیگے ناسٹ پر دل نچھاور کر دیئے تھے۔ اس کے المانوی زبان میں لکھے گئے محبت نامے Love Letters اپنے گھر میں چھپ چھپ کر ڈکشنری کی مدد سے پڑھا کرتے تھے۔ اقبال نے ایک نظم دریائے نیکر کے کنارے لکھی بھی ہے۔ اقبال کے خطوط ان کی چاہت کے گواہ ہیں۔ محبت کو اندھی Love is Blind کہا جاتا ہے۔ اس میں عمر کو نہیں دیکھا جاتا۔

خامہ بگوش نے جوش اور ان کے بچوں کے درمیان پائی جانے والی کشیدگی کا حوالہ دیا ہے۔ یہ بات جوش ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ سرسید اور ان کے بیٹے کے تعلقات بھی تلخ تھے۔ محمد علی جناح اور ان کی بیٹی دینا کے بیچ تلخیوں اور کشیدگی کی دیوار حائل تھی۔ وہ ہندوستان ہی میں رہ گئی۔ اپنے باپ کے پاس پاکستان نہیں گئی۔ ساحر کی اپنے والد سے کبھی نہیں بنی۔ مغل شہنشاہ اکبر اور اس کے بیٹے جہانگیر کے درمیان معرکہ آرائیاں ہوتی رہیں۔ جہانگیر نافرمان رہا۔ جمشید قلی نے اپنے باپ قطب الملک کا قتل حالت نماز میں کروایا۔ جاوید اختر اور جاں نثار اختر کے درمیان تناؤ رہا۔ جاوید ممبئی میں فٹ پاتھ پر سوتا رہا لیکن اپنے باپ کے گھر نہیں رہا۔ ایسی بہت سی مثالیں ہیں۔ اس معاملہ میں جوش کو ٹارگٹ بنانا ٹھیک نہیں۔

جوش کی شاعری کا تقابل احمد فراز اور ناصر کاظمی کے کلام سے نہیں کیا جاسکتا۔ جوش کی شاعری قاری سے علمی استعداد طلب کرتی ہے۔ جوش کی قدر و منزلت پاکستان کیا کرتا۔ اس شاعر اعظم کو تو اپنی دھرتی یعنی ہندوستان ہی میں رہنا تھا۔ یہاں ان کے ہمدرد، غمگسار وزیر اعظم نہرو تھے۔ چاہنے والے بے شمار تھے۔ جوش کی شاعرانہ عظمتیں مسلمہ ہیں۔ ان کے تذکرے کے بغیر اردو ادب مکمل نہیں ہوسکتا۔ فراق نے انہیں شاعر اعظم تسلیم کیا ہے اور اپنی رباعیات کے مجموعہ روپ کو شاعر اعظم جوش کے نام معنون کیا ہے۔

مسعود جعفری۔ حیدرآباد

Mr. Mohd. Shahid Pathan
582, O.T.C. Scheme,
UDAIPUR - 313 001

Mr. Muslim Nawaz
C/o. Baitul Kasim, # 12/3/H/1,
Patwar Bagan Lane, KOLKATA - 700 009

Mr. Jameel Nizamabadi
9-19-64/A, New Water Tank, Malapally
Nizamabad - 503 001

Mr. Akhtar Shahjahanpuri
Rangeen Chaupal, Shahjahanpur - 242 001
Uttar Pradesh.

Ms. Anees Perveen
11-5-186/1, Ground Floor, Red Hills
HYDERABAD - 500 004 (T.S.)

Mr. Abid Ali Abid
10, Gulistan Colony, Badam Nagar
Aligarh - 202 002 - Uttar Pradesh

Prof. Ali Ahmed Fatimi
Urdu Department, University of Allahabad
Allahabad.

Dr. Shamsul Hoda Daryabadi
Asst. Prof. Department of Urdu
MANUU, Gachibowli, Hyderabad - 500 032.

Dr. Laiq Salah
354, Mahmood Bagh, Asif Nagar,
Hyderabad - 500 028

Mr. Aseem Kavyani
Flat No. 702, Ketan Apartments
Belvedre Road, Mazgaon,
MUMBAI - 400 010

Mr. Balraj Bakshi
13/3, Eidgah Road, Adarsh Colony
Udhampur - 182 101 (Jammu & Kashmir)

Mr. Ahmad Rasheed
Gali Rehat Wala Kuan, Sarai Rehman
Aligarh - 202 001 - Uttar Pradesh

Mr. Mehboob Pasha Azmi
Dolour Villa, Flat No. 12, No.4 Amerjan St.
Choolaimedu, Chennai - 600 094

Mrs. Qamar Jamali
"Rahat Kadah" H.No. 4-21
Himagiri Nagar Colony, Gandamguda
Hyderabad - 500 008

Prof. Muzaffar Hanfi
D-40, Batla House, Jamia Nagar,
New Delhi 110 025

Mr. Junoon Ashrafi
Ashrafi House, Choti Khagol,
Khagol - 801 105 - PATNA

عطیہ فیضی
ایک بھولی بسری داستان

Regd No. H-HD 970-2015-2017 RNI No. 10922-57

THE "SABRAS" URDU MONTHLY

ORGAN OF IDARA-E-ADABIYAT-E-URDU

Rs. 30/- Vol.79, Issue-01 January 2017 Date of Publication 15th & Postal Date 20th of every month.

Printed and Published by Prof.S.A.Shukoor on behalf of Idara-e-Adabiyat-e-Urdu,
Printed at Tachee Print Systems, Lakdi-ka-pul, Hyderabad and Published at Idara-e-Adabiyat-e-Urdu
Aiwan-e-Urdu, Panjagutta Road, Somajiguda, Hyderabad-500 082 (A.P.) Editor : Prof. Baig Ehsas Ph : 040-23310469